سلسلۂ اصلاح وتربیت ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، قال اللہ تعالیٰ

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

منوّرات ظاہری

یعنی

جسمانی وظاہری عبادات

نماز
زکوٰۃ
روزہ
حج
تلاوتِ قرآن
ذکر اللہ
کسبِ حلال
اتباعِ سنت
امر بالمعروف
نہی عن المنکر
تحفظِ حقوق

مرتب

مولانا محمد عبدالقوی

ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ناشر

برکات بکڈپو
Barakaath Book Depot

سلسلۂ مطبوعات
۶۹

ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

فہرست مشمولات

نمبر شمار	عناوین		صفحہ نمبر
۞	تقریظ گرامی: طبیب الامۃ حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی		۳
۞	تقدیم	پیش گفتار	۵
۱	الصلوٰۃ	نماز	۸
۲	الزکوٰۃ	زکوٰۃ	۲۲
۳	الصوم	روزہ	۳۷
۴	الحج والعمرۃ	حج اور عمرہ	۵۰
۵	تلاوۃ القرآن	قرآن کریم کی تلاوت	۶۸
۶	کثرۃ الذکر	ذکر اللہ کی کثرت	۸۲
۷	کسب الحلال	حلال کمائی کا اہتمام اور اس کی فکر	۹۷
۸	اتباع السنۃ	سنتوں کی پیروی	۱۱۰
۹	امر بالمعروف ونہی عن المنکر	اچھی باتوں کا حکم دینا اور بُری باتوں سے روکنا	۱۲۳
۱۰	تحفظ الحقوق	آپسی حقوق کی حفاظت کرنا	۱۴۱

تقریظ گرامی: محسنی و مشفقی طبیبُ الامت حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی

خلیفہ و جانشین حضرت محی السنہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ

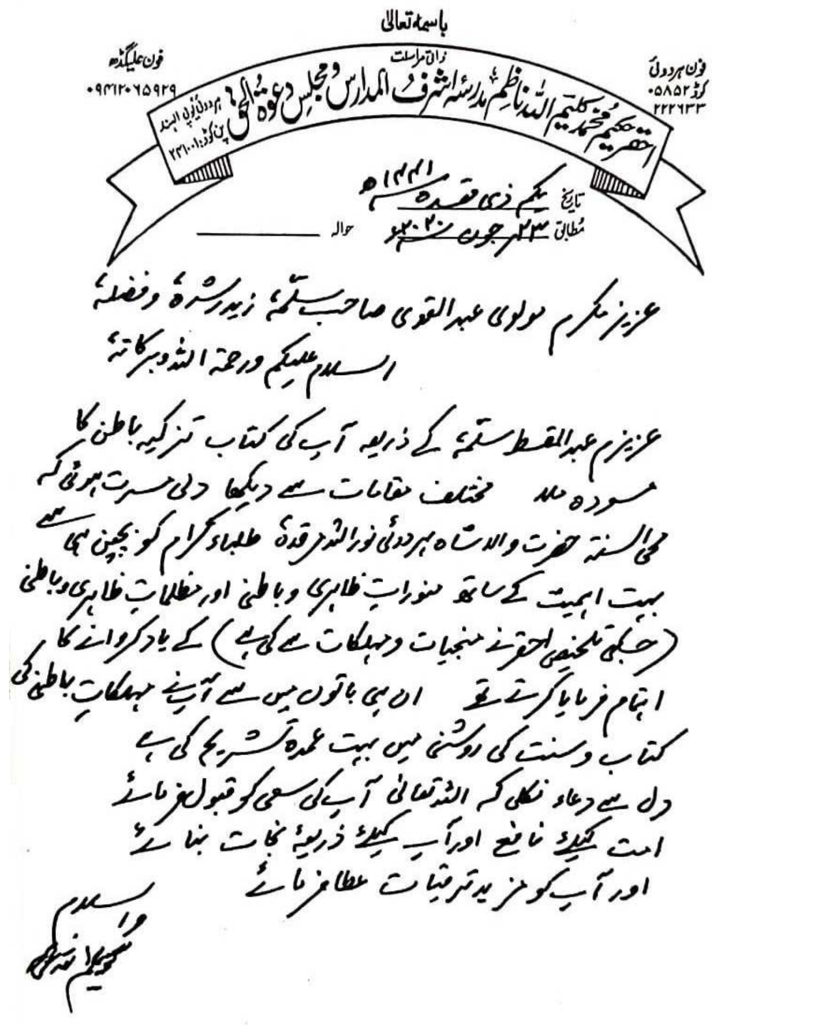

باسمہ تعالیٰ

فون علیگڈھ 09412065929

فون ہردوئی کوڈ 05852 222633

ذاتی مراسلت

احقر حکیم محمد کلیم اللہ ناظم مدرسہ اشرف المدارس و مجلس دعوۃ الحق ہردوئی یوپی الہند پن کوڈ: 241001

تاریخ یکم ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ

مطابق ۲۳ جون ۲۰۲۰ء

حوالہ ______

عزیز مکرم مولوی عبد القوی صاحب سلمہٗ زید رشدہٗ و فضلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عزیزم عبد المقسط سلمہٗ کے ذریعہ آپ کی کتاب تزکیہ باطن کا مسودہ ملا مختلف مقامات سے دیکھا دلی مسرت ہوئی کہ محی السنہ حضرت والا شاہ ہردوئی نور اللہ مرقدہٗ طلباء کرام کو بچپن ہی سے بہت اہمیت کے ساتھ منورات ظاہری و باطنی اور مظلمات ظاہری و باطنی (جس کی تلخیص احقر نے منجیات و مہلکات سے کی ہے) کے یاد کروانے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے ان ہی باتوں میں سے آپ نے مہلکات باطنی کی کتاب و سنت کی روشنی میں بہت عمدہ تشریح کی ہے

دل سے دعاء نکلی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی کو قبول فرمائے امت کیلئے نافع اور آپ کیلئے ذریعۂ نجات بنائے اور آپ کو مزید ترقیات عطا فرمائے

والسلام

محمد کلیم اللہ

نوٹ: حضرت حکیم صاحب مدظلہ نے یہ تحریر ''تزکیہ باطن'' کے لئے عنایت فرمائی تھی، برکۃً یہاں بھی شامل کرلی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ دس اُمور ہیں جنہیں مُنوّ راتِ ظاہرہ یعنی اعضائے ظاہری کو پابندِ شریعت اور روشن کرنے والے اعمال قرار دیا گیا ہے۔

اِن امور کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے بالخصوص راہِ خدا میں ترقی کے آرزو مند سالکین کو تو اور زیادہ اہتمام سے ان کی پابندی کرنا چاہیئے، اس لئے کہ بِنا پابندیِ شریعت کے کوئی سلوک خدا تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ نہیں ہوسکتا۔

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ وبہ نستعین

اللہ پاک نے انسانوں کو اس دنیا میں بندگی کی آزمائش کے لئے پیدا فرمایا ہے، یہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد ہے، اس مقصد اور اس کی اچھی طرح اور آسانی کے ساتھ تکمیل کا طریقہ اور سلیقہ سکھانے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، انبیاء کے سلسلے کی آخری اور تکمیلی کڑی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، آپ نے بھی نبوت کے اظہار کے بعد زندگی کے اس حقیقی اور واحد مقصد سے باخبر کر کے اس کو پورا کرنے کا طریقہ علم اور عمل دونوں ذریعے سے اُمت کو سکھایا۔

اور وہ یہ ہے کہ ۱: کچھ ماننے کی باتیں ہیں سب سے پہلے ان کو ماننا اور ۲: کچھ کرنے کے کام ہیں انہیں انجام دینا اور ۳: کچھ نہ کرنے اور بچنے کے کام ہیں اُن سے اپنے آپ کو بچانا نمبر ایک کا تعلق صرف اعتقاد سے ہے عمل سے نہیں، انہیں عقائد اور ایمانیات کہتے ہیں، ان کی صحت و درستی کے بغیر اعمال کوئی معنی نہیں رکھتے، اعمال کا مدار عقیدے کی سلامتی پر ہے۔

نمبر دو کا تعلق عمل سے ہے انہیں اوامر کہتے ہیں، نمبر تین کا تعلق عزم وارادے سے ہے، انہیں نواہی اور منکرات کہا جاتا ہے، پھر ان اوامر و نواہی کی تین قسمیں ہیں قولی، قلبی، اور جسمانی۔ قولی اوامر جیسے توحید و رسالت کا اقرار، اذکار و نماز، تلاوتِ قرآن وغیرہ اور قولی نواہی جیسے کفریہ کلمات، سب وشتم اور غیبت وغیرہ؛ بدنی اوامر جیسے نماز، روزہ، حج و جہاد وغیرہ، بدنی نواہی جیسے قتل، زنا، ظلم وغیرہ؛ قلبی اوامر جیسے صدق و اخلاص، تواضع و عبدیت، صبر و شکر وغیرہ، قلبی نواہی جیسے تکبر، ریا، اور بغض و حسد وغیرہ۔

ان احکام کی بہت تفصیل ہے، مجموعی طور پر ان کو ''دینِ اسلام'' کہا جاتا ہے، سہولت

کے لئے انہیں دونام دیئے جاتے ہیں، ایمان یعنی عقائد اور اسلام یعنی اعمال۔ پھر اعمال کچھ ظاہر بدن سے تعلق رکھتے ہیں بعض باطن سے، ظاہری احکام کا نام ''فقہِ ظاہر'' اور باطنی احکام کا نام ''فقہ باطن'' قرار پایا۔

اب خلاصہ یہ نکلا کہ مومن کامل بننے یعنی مقصد حیات کو پانے کے لئے وہی تین کام کرنے ہوتے ہیں، ا عقیدے کی درستگی، ۲ اعمالِ ظاہرہ کی تعمیل، ۳ اعمالِ باطنہ کی تکمیل۔

اس کے لئے ان باتوں کا علم حاصل کرنا سب سے پہلے ضروری ہے اس لئے کہ علم کے بغیر عمل کا وجود میں آنا ممکن نہیں اور اگر آ بھی جائے تو احکام کے مطابق ہونا ضروری نہیں اور احکام کے مطابق نہ ہوں تو قبولیت نہیں ہوسکتی، قبولیت نہ ہو تو مقصدِ حیات میں ناکام ہو کر اس کے انجام نارِ جہنم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج کل ماشاءاللہ مقصد حیات کو پورا کرنے اور بندگی کا فریضہ سرانجام دینا چاہنے والوں کی کمی نہیں لیکن اُن کے سامنے صحیح علم اور کام کی ترتیب بالکل نہیں ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ سالکین راہِ طریقت کے واسطے ایک آسان اور مختصر سالائحہ عمل کتاب وسنت اور بزرگوں کی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کیا جائے، چناں چہ بعون اللہ تعالیٰ یہ نو رسائل کا سلسلہ مرتب کیا گیا ہے، جن میں سے ایک یہ رسالہ ''تزکیہ باطن'' بھی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان رسائل کا تعارف یہ ہے کہ حضرت محی السنہؒ طالب علموں کو امام غزالیؒ کی اربعین خلاصۂ احیاء علوم الدین کے عنوانات (منوراتِ ظاہری، منوراتِ باطنی، اور مہلکاتِ باطنی کے نام سے) یاد کرواتے تھے، جو دس دس کر کے جملہ تیس ہیں، میں نے بھی بچپن ہی میں انہیں رٹ لیا تھا، لیکن اب اس عمر میں جا کے ان کی تفصیل کو باقاعدہ سمجھنے کی نوبت اس طرح آئی کہ یہ رمضان المبارک ''کرونا وائرس'' کی وجہ سے ''لاک ڈاؤن'' میں گذرا، اپنے کمرے ہی میں نمازیں اور تراویح ادا ہوتی رہیں، احباب کے تقاضے پر بعد نماز تراویح ایک سلسلہ ''آن لائن دروس'' کا شروع کیا گیا، خیال ہوا کہ ضروری اصلاحی مضامین مرتب طریقے

پر بیان کئے جائیں، من جانب اللہ انہی تیس باتوں کی طرف توجہ ہوئی تو امام غزالیؒ کی عظیم انقلابی تصنیف ''احیاء علوم الدین'' کو سامنے رکھ کر یہ دروس دئے جاتے رہے، اور الحمدللہ مفید ثابت ہوئے، احباب کا اندازہ ہے کہ کوئی اسی پچاسی ہزار مسلمانوں نے مختلف مما لک میں ان دروس کو سنا، سامعین کی طرف سے بھی فرمائشیں آئیں اور مجھے بھی داعیہ ہوا کہ انہیں مرتب کر کے شائع کیا جائے تا کہ سالکین راہِ خدا اپنے مطالعے میں رکھ سکیں اور مشائخ بہ طور نصاب کے اپنے مریدین میں تعلیم کر سکیں، چناں چہ استفادے کی سہولت کے لئے مُنوراتِ ظاہری، منوّرات باطنی، مہلکاتِ باطنی اور آفات اللسان الگ الگ رسائل کی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں[1] اور باقی پانچ یہ ہیں: قصد السبیل الی المولی الجمیل، جزاء الاعمال، عقائدِ اسلام وشعب الایمان، آداب المعاملۃ والمعاشرۃ، اور معمولاتِ مسنونہ

میں بہت ممنون ہوں محسنی ومشفقی حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہٗ العالی کا کہ پیرانہ سالی اور صحت کی ناسازی کے باوجود حضرت نے اسے پڑھوا کر سُنا اور اپنی دعاؤں سے نوازا، اور عزیزم مولانا خواجہ نصیرالدین قاسمی سلمہ کا کہ ٹائپ، تصحیح اور مراحل طباعت میں ان کی مسلسل معاونت قابل قدر و لائق تحسین ہے۔ حق تعالیٰ انہیں ظاہری و باطنی ترقیات سے نوازے۔ آمین۔

والسلام
محمد عبدالقوی غفرلہٗ
۱۲ر رمضان المبارک ر ۱۴۴۲ھ
م ۲۵ر اپریل ر ۲۰۲۱ء

[1] زیر نظر رسالہ ان چار میں سے ایک ہے۔

۱

الصلوٰۃ

نماز

(الف)

نماز پڑھنے کے فوائد

نماز اسلام میں سب سے بڑی اور سب سے بنیادی عبادت ہے، دین کا ستون ہے، یقین کی مضبوط رسی ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا اہم وسیلہ ہے، تمام نیکیوں کی شان ہے، نبی کریم ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، مومن کے دل کا سرور وسکون ہے، ایمان کی پہچان ہے، کفر وایمان کے درمیان حد فاصل ہے، نماز ہی وہ عمل ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں ہے[۱]۔ اس مبارک اور باعظمت عمل کے اس کے علاوہ بھی اور بے شمار فضائل وبرکات ہیں۔ ذیل میں نماز کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے کچھ تفصیل بیان کی جارہی ہے۔:

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳ میں ایمان والوں کی سب سے پہلی صفت کے طور پر نماز کا ذکر کیا ہے:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (البقرہ:۳)	ایمان والے وہ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔

[۱] سوائے اس کے کہ مجنون ہو یا اشارے سے پڑھنے کی طاقت بھی نہ رہی ہو، عورت کی حیض ونفاس یعنی ناپاکی کے دوران چھوٹی ہوئی نمازیں بھی معاف ہیں۔

سورۃ المؤمنون کی آیت نمبر ۲ میں نماز کو فوز وفلاح یعنی کامیابی قرار دیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ — جو مسلمان جی لگا کر نماز پڑھتے ہیں وہ یقیناً فلاح پا گئے یعنی کامیاب ہو گئے۔

(سورۃ المومنون:۱۔۲)

□ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۳۲ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نماز پر ثابت رہنے اور گھر والوں کو بھی پابند رکھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ (سورۃ طٰہٰ:۱۳۲) — اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے۔

□ سورۃ البینہ کی آیت نمبر ۵ میں پچھلی امتوں کو بھی نماز کا حکم دیئے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے نماز کو دینِ قیّم قرار دیا۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڏ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵ — ان لوگوں کو بس اس کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرلیں یکسو ہوکر، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور یہی مضبوط اور (سچا) دین ہے۔

(سورۃ طٰہٰ:۱۳۲)

□ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۷ میں صحابہ کرامؓ کا نمازوں کا اہتمام بیان کرکے ان کی تعریف فرمائی گئی ہے۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۽ يَخَافُوْنَ يَوْمًا — ایسے لوگ جن کی تجارتیں اور خرید وفروخت انہیں اللہ کی یاد کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے سے غفلت

تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ میں نہیں ڈالتیں ، یہ لوگ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس دن کی دہشت سے آنکھیں اور دل پلٹ جائیں گے۔ (سورۃالنور:۳۷)

⟐سورۂ مریم کی آیت نمبر ۵۵ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ (سورہ مریم:۵۵)

⟐سورۂ مریم کی آیت نمبر ۳۱ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ماں کی گود کے اندر بہ طور معجزہ نماز اور زکوٰۃ کے آسمانی حکم کا ذکر فرمایا:

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید فرمائی، تاوقتے کہ میں زندہ رہوں۔ (سورہ مریم:۳۱)

⟐سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۴۰ میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کا اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نمازوں کی دعا مانگنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے دعا میں فرمایا تھا:

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا ، اے ہمارے رب ہماری دعائیں قبول فرما۔ (سورۂ ابرھیم:۴۰)

⟐سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۴۳ میں بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ کو بھی نماز کا حکم دئے جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ﴿۴۳﴾ (سورۃ البقرہ:۴۳)	اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

▯سورۂ ابراھیم کی آیت نمبر ۳۱ میں اپنے مومن بندوں کو نماز کی تاکید کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ

قُلۡ لِّعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خِلٰلٌ﴿۳۱﴾ (سورۂ ابرھیم:۳۱)	اے نبی! آپ میرے بندوں سے فرمادیجئے کہ وہ نماز قائم کریں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے دکھا کر، چھپا کر (ہر طرح) خرچ کرتے رہیں اس دن کے آنے سے پہلے پہلے کہ جس دن نہ خرید وفروخت ہوگی نہ ہی دوستیاں کام آئیں گی۔

▯قرآن کریم میں نماز کے سلسلے میں نازل شدہ ۶۵ آیتوں میں سے یہ ۱۰ آیتیں بہ طور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ان آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دینِ اسلام میں سب سے اہم عبادت نماز ہے اور ایمان کے بعد اس سے افضل کوئی عمل نہیں ہے، بلکہ بعض علماء نے تو اسے جزوِ ایمان مانا ہے۔ جہاں تک نماز کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کا تعلق ہے تو وہ بہت ہیں، یہاں صرف فضائل سے متعلق چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، لا الٰہ الا اللہ محمد رّسول اللہ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا''۔ (بخاری:8)

حدیثِ جبرئیلؑ میں ہے کہ جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اسلام کے بارے میں دریافت کیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم لا الٰہ الا اللہ محمد

رّسول اللہ کی گواہی دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان المبارک کے روزے رکھو، اور تم سے ہو سکے تو حج بیت اللہ کی تکمیل کرو'' (مسلم:2)

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں، جو کوئی شخص اچھی طرح وضو بنا کر ان پانچ نمازوں کو ان کے وقت پر ادا کرے، رکوع سجود اطمینان سے کرے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی ضرور بخشش کرے گا اور جو نمازوں کا اہتمام نہ کرے اس کے لئے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں ہے، چاہے بخشش کرے چاہے عذاب دے''۔ (ابوداؤد:425)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی ایسے گناہ کی اطلاع کی جس پر حد جاری کی جاتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی جانب زیادہ التفات نہ فرمایا، یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوا تو سب نے نماز ادا کی، اس کے بعد پھر اس نے یاد دہانی کرائی کہ مجھ پر حد جاری کر کے مجھے گناہ سے سبک دوش کر دیا جائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟'' اس نے عرض کیا نماز تو پڑھا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ نے تیرے گناہ کو بخش دیا''۔ (بخاری:6823)

ایک حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے افضل عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: ''نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا'' یہ سوال بار بار دہرایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر دفعہ یہی فرمایا۔ (مسند احمد)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جنت کی کنجی نماز ہے'' (مسند احمد:14662)

ایک حدیث میں ہے کہ ''لوگو! خوب سمجھ لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے بہترین عمل نماز ہے''۔ (ابن ماجہ:۲۷۷) ایک دوسری روایت میں بہ جائے بہترین عمل کے افضل ترین عمل فرمایا گیا ہے۔

ا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری دنوں میں جبرئیل علیہ السلام نے صحابہ کرامؓ کے مجمع میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند سوالات کئے تھے، جو دین کے بنیادی احکام پر مشتمل تھے، اس کو حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے سامنے خزاں کے موسم میں ایک درخت کی ٹہنی ہاتھ میں لے کر ہلائی جس سے اس کے سارے پتے جھڑ گئے، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا: ''ابوذر! جو کوئی مومن بندہ رضائے الٰہی کے واسطے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ایسے ہی جھڑ جاتے ہیں جیسے یہ پتے ٹہنی سے جھڑ رہے ہیں''۔ (مسند احمد: ۱۷۹/۵)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ ''اگر تم میں سے کسی کے گھر کے سامنے نہر بہتی ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل رہے گا؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہرگز نہیں رہے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے کہ اگر کوئی ان کی پابندی کرے تو اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعہ اس کے گناہ مٹا دے گا''۔ (بخاری: 528)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے پانچ نمازوں کی پابندی کی، رکوع سجود اور اوقات کا خیال رکھا، اور یقین رکھا کہ یہ نمازیں اللہ تعالیٰ کا حق لازم ہیں تو وہ جنت میں داخل ہو گیا'' یا فرمایا ''جنت اس پر واجب ہوگئی'' یا یہ فرمایا ''جہنم اس پر حرام ہوگئی'' راوی کو شک ہے مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ (مسند احمد: 18373)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ ''جس نے ان کی حفاظت کی (یعنی پابندی اور اہتمام سے ادا کیا) تو یہ نمازیں اس کے لئے قیامت کے دن روشنی، حجت، اور نجات ثابت ہوں گی، اور جس نے پنج وقتہ نمازوں کی حفاظت نہیں کی اس کے لئے قیامت میں نہ روشنی ہوگی نہ حجت اور نہ نجات بلکہ وہ شخص قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف (جیسے بدنصیبوں) کے ساتھ ہوگا''۔

(مسند احمد: ۱۶۹/۲)

ایک حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب عمل کونسا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نماز کو بروقت پڑھ لینا''۔ (بخاری: 527)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت کیا کہ کوئی ایسا عمل بتادیجئے جس کی پابندی پر اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرما دیں تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم اخلاص کے ساتھ کثرت سے نمازیں پڑھا کرو، اس لئے کہ تم جب بھی کوئی سجدہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمہارا ایک درجہ بڑھائیں گے اور تمہارا ایک گناہ مٹائیں گے''۔(مسلم:488)

ایک حدیث میں ہے کہ ''اس دنیا کی مجھے تین چیزیں محبوب ہیں، خوشبو، عورتیں (یعنی بیویاں) اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''(نسائی:3939)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض الوفات کے دوران فرمارہے تھے ''نمازوں اور اپنے ماتحتوں کا خیال رکھنا''۔(شعب الایمان:8553)

(ب)

نماز باجماعت کے فوائد

جیسے نماز ایک اہم ترین فریضہ ہے ویسے ہی مردوں کے لئے مسجد میں باجماعت کرنا بھی بہت اہم مسئلہ ہے اور اس کی بڑی فضیلت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

اور نماز قائم کرو، اور زکوۃ ادا کرو، اور نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔

(سورۃ البقرہ:۴۳)

آیت میں خطاب اگرچہ یہودیوں سے ہے اور نماز کو رکوع اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کی نماز میں رکوع نہیں تھا مگر اس سے باجماعت نماز پڑھنے کا حکم بھی ثابت ہوتا ہے، وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کا ترجمہ کیا جاتا ہے صَلُّوْا مَعَ الْمُصَلِّيْنَ یہود کو جب یہ حکم دیا جارہا ہے کہ ایمان لاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان باجماعت نماز پڑھتے تھے، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ سب لوگ باجماعت نماز پڑھیں، اسی لئے بعض مفسرین

نے آیت کے تحت نماز باجماعت کا مسئلہ بھی اُٹھایا ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ نماز باجماعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

نماز صرف ایک عبادتی فریضہ نہیں ہے بلکہ وہ ایمان کی نشانی اور اسلامی شعار بھی ہے، نماز کا ادا کرنا اسلامیت کا ثبوت ہے، اس سے بے اعتنائی اللہ ورسول سے بے تعلقی کی علامت ہے، اس لئے ضروری تھا کہ نماز کی ادائیگی کا کوئی ایسا نظام بنایا جاتا کہ ہر شخص اس اہم فریضے کو علی الاعلان ادا کرسکتا اور سب کے سامنے ادا کرسکتا، چناں چہ اسی مقصد کے لئے اللہ کی ہدایت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے باجماعت نمازوں کا نظام قائم فرمایا، اور ہر مسلمان کے لئے ــــ اگر وہ بیمار یا معذور نہ ہوتو ــــ جماعت سے نماز کو لازمی قرار دیا۔

..... نیز تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اس نماز باجماعت والے نظام کے طفیل بہت سے وہ لوگ بھی نماز کی پابندی کرتے ہیں جو ہمت کی کمی اور جذبے کی کم زوری کی وجہ سے انفرادی طور پر کبھی ایسی پابندی نہ کرسکتے تھے..... اس کے علاوہ اس نظام کی برکت سے لوگوں کی دینی تعلیم وتربیت اور ایک دوسرے کے احوال سے باخبری اتنی آسانی سے ہوجاتی ہے کہ اس کا بدل سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ (معارف الحدیث: ۱/۱۲۴)

نماز باجماعت کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات بھی سامنے رکھنے چاہئیں:

ارشادفرمایا: ''باجماعت نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے''۔ (بخاری: 1645) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تنہا نماز پڑھنے سے اگرچہ نماز ہوجاتی ہے لیکن ثواب بہت زیادہ گھٹ جاتا ہے جو کہ ہمارا بہت بڑا خسارہ ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص چالیس دن تک پابندی سے باجماعت نماز ادا کرتا رہے اس طور پر کہ تکبیرِ اولیٰ بھی (امام کے ساتھ) فوت نہ ہوتو اس کے لئے دو براءتیں لکھ دی جاتی ہیں ایک جہنم سے براءت، دوسرے نفاق سے براءت'' (ترمذی: 241)

اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ باجماعت اور تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب عمل ہے اور اس کی پابندی پر دوزخ اور نفاق سے براءت

کی عظیم بشارت سنائی گئی ہے۔اسی وجہ سے صحابہؓ کے ماحول میں کسی کو جماعت چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ مسلمانوں کے اہتمام کو دیکھ کر منافقین بھی مجبور تھے کہ وہ اپنے نفاق کو چھپانے کے لئے نماز باجماعت میں ضرور شریک رہتے، ورنہ صحابہؓ اس کا منافق ہونا طئے کرلیتے تھے جو جماعت کی نماز میں شریک نہیں ہوتا تھا۔دوسرے یہ کہ کسی عمل کو چالیس دن مسلسل کرنا اس عمل سے مناسبت اور پابندی کا مؤثر ذریعہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ''ہم لوگ (نبی کریم ﷺ کے دور میں) دیکھتے تھے کہ مشہور منافق کے علاوہ کوئی شخص نماز باجماعت کو ترک نہیں کرتا تھا، یا پھر سخت بیمار آدمی، بلکہ بیمار بھی اگر دو آدمیوں کے سہارے مسجد آسکتا تو لایا جاتا تھا، نبی کریم ﷺ نے ہمیں ہدایت والے طریقے عطا فرمائے ہیں، اور یہ نماز باجماعت بھی ہدایت والے طریقوں میں سے ایک ہے''۔(مسلم:654)

عورتوں کے لئے جماعت کا حکم

البتہ یہ حکم اور فضیلت صرف مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں، ایک تو ان لوگوں کی خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ اس کا اہتمام مشکل ہے، دوسرے جن مقاصد کے لئے جماعت مشروع ہے ان مقاصد کے لئے ان کی شرکت کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے، چناں چہ حدیث پاک میں ہے: اُم حمید ساعدیہؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میں آپ کے ساتھ نماز ادا کرنا چاہتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پتہ ہے کہ تم میرے پیچھے نماز ادا کرنے کی خواہش مند ہو لیکن تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا گھر میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور گھر میں پڑھنا صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے اور اپنے صحن میں پڑھنا محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے اور محلے کی مسجد میں پڑھ لینا میری اس مسجد میں آکر پڑھنے سے بہتر ہے''۔ یہ بات اس قدر تفصیل کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے انہیں سمجھائی کہ انہوں نے اپنے گھر کے کونے اور اندھیرے مقام پر ایک جگہ متعین کرلی اور عمر بھر وہیں نماز ادا کرتی رہیں۔(مسند احمد:27090)

اس کے علاوہ اور بھی کئی حدیثیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد عورتوں کو مسجد میں جمع کرنا نہیں تھا، مثلاً ''عورتوں کے لئے نماز پڑھنے کی بہترین جگہ ان کے گھروں کے اندرونی حصّے ہیں'' (حاکم :756) ''اللہ کی بندیوں کو مسجد آنے سے نہ روکو تاہم ان کے گھر ہی ان کے لئے (نماز پڑھنے کی) بہترین جگہ ہیں'' (ابوداؤد:567) ''یقیناً عورت کی عنداللہ سب سے محبوب نماز وہ ہے جو اپنے گھر کے محفوظ اور اندھیرے مقام پر ادا کی گئی ہو'' ۔(ابن خزیمہ : 1691) ۔ پھر جو عہدِ رسالت میں خواہش مند خواتین کو اجازت دے دینے کے لئے فرمایا گیا تھا تو ۱ اس کی ترغیب بالکل نہیں دی گئی تھی ۔ ۲ گھر کی نماز کے فضائل بتادئے گئے تھے ۔ ۳ بن سنور کے آنے سے منع کر دیا گیا تھا ۔ ۴ دن کی نمازوں میں اجازت نہیں تھی ۔ ۵ صفوں کے آخر میں بیٹھنے کی تاکید کر دی گئی تھی ۔ ۶ دروازہ علاحدہ کر دیا گیا تھا ۔ ۷ خاص صحابیات کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گھر میں پڑھ لینے کو ترجیح دی تھی ۔ ۸ اجازت لینے والی صحابیہ کو حکمت سے منع کر دیا گیا تھا ۔ ۹ پھر بعد میں صدیقہ عائشہؓ وغیرہ نے بدلتے حالات کے پیشِ نظر اس کی صریح مخالفت بھی کی تھی، ان سب وجوہ سے مستورات کو چاہیئے کہ وہ گھروں میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیں، کسی ضرورت سے باہر نکلے ہوں اور وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو یا مثلاً محرم کے ساتھ نماز کے لئے مسجد پر رُکے ہوں تو ان صورتوں میں عورتوں کا مسجدوں میں نماز پڑھنا ممنوع نہیں ہے لیکن آج کل مقاصد شریعت اور مصالحِ دین سے ناواقف مردوں اور عورتوں کی طرف سے جس قسم کے ترغیبی بیانات آرہے ہیں بالخصوص یورپ کے نام نہاد اسکالرز نے جو باتیں پھیلا رکھی ہیں دین پسند عورتوں کو اُن سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے ۔

(ج)

نماز چھوڑنے کے نقصانات

قرآن وحدیث میں جہاں نماز پڑھنے کے بہت فضائل ہیں وہیں نماز چھوڑنے اور ترک کر دینے یا قضا کر دینے کی سخت مذمتیں بھی آئی ہیں، ظاہر ہے کہ نماز جب شعارِ ایمان و

اسلام ہے اور بندگی کی خاص شان ہے تو اس کا ترک سخت ترین گناہ ہونا ہی چاہیئے۔ چناں چہ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورۃ البقرہ:۴۳)

اور نماز قائم کرو، اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ نماز قائم کرنا جہاں دین وایمان ہے نماز کا ترک کر دینا مشرکوں والا عمل اور ان سے مشابہت ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (سورۂ مریم:۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ آئے جنہوں نے نمازیں ضائع کردیں اور خواہشات کی پیروی کی، عن قریب یہ لوگ غَیّ میں داخل ہوں گے۔

غَیّ جہنم میں ایک خوف ناک اور خطرناک وادی ہے، اور نمازیں ضائع کر دینے سے مراد بے وقت یا زبردستی ادا کرنا ہے، بالکل ترک کر دینا مراد نہیں ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾ (سورۃ المنافقون:۹)

اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد (نماز) سے غافل نہ کردے، جو کوئی ایسا کریں گے وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس آیت میں ''ذکر اللہ'' سے پنج وقتہ نمازیں مراد ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ (سورۃ الماعون:۴-۵)

تو بربادی ہے اُن لوگوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”یہ وہ لوگ ہیں جو نمازوں کو اپنے وقت سے مؤخر کردیتے ہیں“ یعنی قضا کردیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۱/۳۲۵)

ایک حدیث میں ہے کہ ”جو شخص نمازوں کی حفاظت اور پابندی نہیں کرے گا اس کے لئے قیامت کے دن نہ نور ہوگا نہ حجت نہ نجات۔ بل کہ وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا“۔ (مسند احمد: ۲/۱۶۹) یعنی اگر مال کی وجہ سے نمازیں ضائع کیا تو قارون کے ساتھ، اگر اقتدار و کرسی نماز ضائع کرنے کا سبب بنے تو فرعون کے ساتھ، اگر وزارتوں اور ملازمتوں کے سبب نمازیں ترک کرے تو ہامان کے ساتھ اور اگر تجارت و کاروبار نمازوں کے ترک کا سبب بنے تو اُبی بن خلف کے ساتھ محشور ہوگا وغیرہ۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”جس نے ایک نماز بھی فوت کی تو وہ (نقصان کے اعتبار سے) ایسا ہے جیسا کہ اس کے گھر والے اور اس کا مال سب ضائع ہو گیا ہو“۔ (ابن حبان: ۳/۱۴۶۶)

ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ ”جس شخص نے دو فرض نمازیں بغیر عذر کے جمع کر کے ایک ساتھ پڑھیں تو وہ کبائر کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر آ گیا“ یعنی بہت بڑا گناہ کیا۔ (ترمذی:188)

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت میں بندے سے سب سے پہلے جس عمل کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہی ہے، اس کی نمازیں دیکھی جائیں گی، اگر وہ صحیح نکل گئیں تو وہ کامیاب ہوگا۔ (یعنی جنت میں جائے گا) اور اگر نمازوں کا معاملہ صحیح نہ نکلا تو ناکام ہوگا اور نقصان اُٹھائے گا“ (یعنی جہنم میں جائے گا)۔ (الترغیب والترہیب:527)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ”کبھی اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، چاہے تجھے کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے اور کبھی فرض نماز قصداً ترک نہ کرنا، اس لئے کہ جو شخص جان بوجھ کر فرض نماز ترک کردیتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بخشش کا وعدہ ختم ہو جاتا ہے“۔ (ابن ماجہ:4034)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ہمارے اور ان (کافروں)

کے دمیان جوفرق ہے وہ نماز کا ہے، پس جس نے (قصداً) نمازیں ترک کیں اس نے کفر کیا''۔(ترمذی:2621)

ایک حدیث میں ہے کہ''اپنے بچوں کو جب وہ سات برس کے ہوجائیں تو نمازوں کی تلقین کرواور جب وہ دس برس کے ہوجائیں (اور وہ نمازوں سے غفلت کریں) تو ان کی پٹائی کرو''۔(ترمذی:408)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز کا چھوڑنا اسلام میں بہت بڑا گناہ بلکہ کفر وشرک کے برابر عمل ہے، نیز اللہ تعالی کی ناراضگی، دنیاوآخرت کی تباہی کا ذریعہ ہے حتیٰ کہ قارون وفرعون جیسے بدنصیبوں کے ساتھ حشر کئے جانے کی وعیدیں بھی آئی ہیں۔اللہ بچائے۔اسی وجہ سے ہمارے ائمہ اور فقہاء نے بے نمازی کے سلسلے میں بہت سخت موقف اختیار کیا ہے، چناں چہ امام اعظم ابوحنیفہؒ بے نمازی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اُسے قید میں بند کر کے روزانہ سزا دی جاتی رہے یہاں تک کہ وہ توبہ کر کے نمازی بن جائے۔امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بے نمازی بہت بڑا گناہ گار ہے اور چوں کہ دس برس کے بچے کو نماز نہ پڑھنے پر ضرب یعنی مارنے کی سزا رکھی گئی ہے اس لئے بالغ ہوکر بھی اگر نماز نہ پڑھے تو اُسے قتل یعنی موت کی سزا دے دینی چاہیئے، امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے لیکن ان کا دوسرا قول بہت سخت ہے کہ بے نمازی مُرتد کافر ہے، اس کو قتل کردینا چاہیئے نہ نمازِ جنازہ پڑھنا چاہیئے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہیئے، اللہ اکبر! اس کے بعد بھی کیا کوئی نمازوں میں لاپرواہی اور کوتاہی کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نماز چھوڑنے کے وبال سے بچائے۔آمین

(د)

جماعت کی نماز ترک کرنے کے نقصانات

سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس میں سے چھبیس درجہ ثواب کم ہوجاتا ہے، نیز ان تمام فوائد ومصالح سے محروم رہ جاتا ہے جن کا ذکر باجماعت نماز

کے مقاصد میں ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت صراحت سے گھروں میں نماز پڑھ لینے والے مردوں کی مذمت بیان فرمائی ہے جو رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے، چناں چہ ارشادِ نبوی ہے: ''جس نے اذان سنی اور اسے مسجد حاضر ہونے سے کوئی عذر مانع بھی نہ تھا (پھر بھی گھر میں ہی نماز ادا کرلی) تو اس کی پڑھی ہوئی نماز قبول نہ ہوگی'' پوچھا گیا کہ عذر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ''خوف یا مرض''۔(ابوداؤد:551)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جس بستی یا گاؤں میں تین (مسلمان) آدمی ہوں پھر بھی وہ لوگ باجماعت نماز نہیں ادا کرتے تو یقیناً ان پر شیطان مسلط ہو جائے گا''۔(نسائی:847)

ایک حدیث میں ہے کہ ''میرا ارادہ ہے کہ میں مؤذن سے اقامت کہلوادوں اور کسی کو امامت کا حکم دے کر نماز شروع کروادوں، اس کے بعد خود آگ کے شُعلے لے کر بستی میں نکلوں اور ہر اس شخص کے گھر کو آگ لگادوں جو اذان کے بعد بھی مسجد نہ پہنچے''۔(بخاری:657)

نیز حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لئے ہدایت والے طریقے مشروع فرمائے ہیں، اور یہ (اذان کے بعد) جماعت سے نماز پڑھنا بھی انہی ہدایت والے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، اور اگر تم لوگ گھروں ہی میں نمازیں پڑھ لیا کرو گے جیسے فلاں منافق گھر ہی میں نماز پڑھ لیتا ہے تو تم نے اپنے نبی کے طریقوں کو چھوڑ دیا اور جس نے اپنے نبی کے طریقے کو چھوڑا وہ یقیناً گم راہ ہو گیا۔(مسلم:659)

ان تمام احادیث سے پتہ چل گیا کہ نماز کی کتنی اہمیت اور فضیلت ہے اور یہ کہ فرض نمازیں مردوں کو مسجد میں ادا کرنا ضروری ہے بلا عذر گھر پر نہیں ادا کرنا چاہیئے، اس کے برخلاف عورتوں کے لئے گھر ہی میں پڑھ لینا سب سے بہتر ہے وہ بلا ضرورت مسجد نہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان حکموں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نفس و شیطان کے بھٹکانے سے محفوظ رکھے۔آمین

۲

الزکوٰۃ

زکوٰۃ

(الف)

زکوٰۃ وصدقات کی حقیقت ومصلحت

لغوی اعتبار سے زکوٰۃ کے دو معنیٰ ہیں:۔زیادتی واضافہ اور پاکیزگی وطہارت، پہلے معنیٰ کے اعتبار سے زکوٰۃ کا مفہوم ہے اپنے مال کا ایسی جگہ پر خرچ کرنا جس سے من جانب اللہ اس میں خیر وبرکت اور اضافہ ہو، دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے زکوٰۃ کا مفہوم ہے اپنے مال کو ایسی جگہ اور ایسے طریقے سے صرف کرنا جس سے مال میں اور نفس میں پاکیزگی اور صفائی پیدا ہو۔

نیز زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہا جاتا ہے جو صِدق سے مشتق ہے، وہ اس وجہ سے کہ جو آدمی زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ اپنے عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ جزا وسزا کی اپنے عمل سے تصدیق کرتا ہے، اس طور پر کہ اگر وہ دنیا کو ہمیشہ رہنے کی جگہ سمجھتا یا آخرت اور اس میں پیش آنے والے حالات کا منکر ہوتا تو اپنے مال میں بُخل کرتا اور ثواب کی خاطر دوسروں پر خرچ نہ کرتا، گویا ایک مومن فریضۂ زکوٰۃ کو ادا کرنے کے ذریعے اپنے عقیدے اور اپنے عمل میں یکسانیت پیدا کرتا ہے اس لئے اس کو صدقہ کہا جاتا ہے[1]۔

[1] یہاں زکوٰۃ وصدقات میں معروف زکوٰۃ کے علاوہ عشر، خراج، خمس، صدقۃ الفطر اور دیگر صدقاتِ نافلہ وغیرہ سب شامل ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے خرچ کئے جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ زکوٰۃ کو عبادات میں شامل کئے جانے کی مصلحتوں پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ میں جن مصالح کی رعایت رکھی گئی ہے وہ دو ہیں:

پہلی مصلحت کا تعلق تہذیبِ نفس یعنی نفس کی اصلاح و درستی سے ہے وہ اس طرح کہ نفس میں فطری طور پر حرص وطمع اور حبِ مال موجود ہے، اور بدترین صفات ہیں جو آخرت کے مفادات کو نقصان پہنچاتی ہیں، بخیل وحریص آدمی جب مرجاتا ہے تب بھی اس کا دل اپنے مال میں اٹکا ہوا ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، پس اگر کوئی شخص اپنے آپ کو زکوٰۃ ادا کرنے اور راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کا عادی بنالے گا تو وہ اپنے نفس سے بخل وحرص کی نحوست دور کرلے گا جو اس کی عاقبت وآخرت کے حق میں فائدہ مند ہوگا، جب کہ اخبات یعنی عبدیت وبندگی کی صفت کے بعد آدمی کے لئے آخرت میں سب سے زیادہ نفع دینے والی جو صفت ہے وہ **سخاوت** ہے، پس جیسے اِخبات آدمی کو عالمِ ملکوت تک بلند کرنے کا سبب مانا گیا ہے اسی طرح **سخاوت** کا شمار دنیوی خسائس وخبائث سے نجات دلانے والی صفات میں کیا گیا ہے.......۔

زکوٰۃ وصدقات کی دوسری مصلحت کا تعلق حکومت (واجتماعیت) سے ہے، اس طور پر کہ حکومت کم زور معاش اور ضرورت مندوں کی اموال زکوٰۃ سے مدد کرسکے گی کیوں کہ اس کا اپنا کوئی خزانہ نہیں ہوتا، اس طرح حکومت کے انتظامی اخراجات اور رعایا کے مشترکہ مفادات بہ سہولت انجام پاسکیں گے، اسی طرح حالات وحوادث لوگوں کے درمیان منتقل ہوتے رہتے ہیں، صبح کہیں تو شام کہیں، اگر لوگوں کے درمیان غریبوں اور ناداروں پر خرچ اور داد ودہش کا طریقہ رواج نہ دیا جاتا تو محتاج لوگ ہلاک ہوجاتے اور بھک مری کے شکار ہوجاتے......۔

(حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۱۳۹-۱۴۰ بالاختصار)

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں نظامِ زکوٰۃ وصدقات ایک خاص حکمت ومصلحت کے تحت قائم کیا گیا ہے، اس کے تحت بہت سے عنوانات ہیں، مثلاً زکوٰۃ، عشر، خراج، صدقۃ الفطر، نذر، صلۃ الرحم، کفارات اور انفاق وغیرہ جن میں سے بعض کے ساتھ

خاص نصاب ومقدار جُڑی ہوئی ہے اور بعض محض احسان وہم دردی سے وابستہ ہے، اس مختصر وضاحتی نوٹ کے بعد اب قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کے فضائل اور اُن سے غفلت کے نقصانات ملاحظہ کیجئے۔

(ب)

زکوٰۃ وصدقات کے فائدے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (سورۃ البقرہ:۱۷۷)

(نیکی کے شعبوں میں ایمان کے بعد یہ بھی ایک شعبہ اور نیکی کا کام ہے کہ مومن اپنے) مال کو اس کی محبت کے باوجود رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے پر خرچ کرے۔

اس آیت میں اس سے قبل ایمانیات کا ذکر فرمایا اور ان خیراتی کاموں کے بعد بعض اور صفاتِ خیر اور اعمالِ صالحہ کا ذکر ہے، یہاں یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان خیراتی کاموں میں اپنا مال خرچ کرنے کو برّ یعنی نیکی قرار دیا ہے اور جن اعمال کو خود اللہ پاک نیکی فرمائیں اس کی فضیلت کا کیا کہنا؟۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ

اللہ تعالیٰ ربوٰ یعنی سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ناشکرے گنہ گار کو پسند نہیں فرماتا، بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیا اور نماز قائم کی

أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ البقرۃ:۲۷۶،۲۷۷)

اور زکوٰۃ ادا کی ان لوگوں کے لئے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے ، اور انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

ان دو آیتوں میں چند باتیں بتلائی گئی ہیں، ایک یہ کہ ربا یعنی سود کو اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے یعنی یہ کہ وہ دیکھنے میں کتنا ہی عمدہ اور بہت نظر آئے مگر انجام کار اس کو ڈوبنا ہی ڈوبنا ہے۔ دوسرے یہ کہ ربا کے مقابلے میں صدقات یعنی رضائے الٰہی کے لئے اس کے بندوں پر خرچ کیا ہوا مال ہے اس کو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور فضل سے بڑھاتا ہے، کم از کم دس گُنا اور زیادہ سے زیادہ سات سوگُنا اور چاہے تو اس سے بھی زیادہ۔ تیسرے یہ کہ ناحق کسی کا مال کھانا اور حق میں اپنا مال صرف نہ کرنا دونوں بڑے گناہ اور ناشکری کی باتیں ہیں۔ چوتھے یہ کہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے پروردگار کے پاس اجر کا ملنا یقینی بات ہے۔ پانچویں یہ کہ ایسے لوگوں کو نہ دنیا میں کسی چیز کا خوف ہے اور نہ آخرت میں کسی طرح کا غم، یعنی دارین کا سُکھ چین واطمینان انہیں نصیب رہتا ہے۔

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (الاعراف:۱۵۶)

اور میری رحمت بہت وسیع ہے، میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے لازم کروں گا جو تقویٰ اختیار کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں اور جو ہماری آیتوں یعنی قرآن کریم پر ایمان رکھیں۔

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا اہم ذریعہ ہے:

سورۃ الروم میں ارشاد فرمایا:

وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (سورۃ الروم:۳۹)

اور وہ جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر تو ایسے ہی لوگ ہیں جو (اپنا مال) بڑھانے والے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے اُن کی ماں حضرت مریمؑ کی گود میں معجزاتی طور پر جو گفتگو کروائی ان مبارک کلمات میں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے:

وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (سورۂ مریم:۳۱)

اور (اللہ تعالیٰ نے) مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے (کہ) جب تک میں زندہ رہوں (اس کا پابند رہوں)۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (سورۂ مریم:۵۵)

اور وہ اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ رب کے پسندیدہ بندے تھے۔

چند انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ (سورۃ الانبیاء:۷۳)

اور ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی تھی خیر کے کاموں کو کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی، اور وہ ہمارے عبادت گذار بندے تھے۔

معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نماز و زکوٰۃ کا حکم اہتمام سے شامل رہا ہے اور ہر امت کے صالحین نے اپنے مال رضائے الٰہی کے لئے اس کے محتاج بندوں پر دل کھول کے صرف کئے ہیں، اس امت کے لئے بھی راہِ خدا میں صرف کرنا بڑی فضیلت وعبادت کی بات قرار دی گئی ہے۔

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیثِ شریفہ کا تعلق ہے تو وہ بھی بے شمار ہیں، چند

احادیث ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں۔

ایک واقعے کے ضمن میں آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا" بے شک اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ صرف اس لئے فرض فرمائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہارے باقی مال کو پاک کردے"۔(ابوداؤد:1664)

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اپنے اموال کو پاکیزہ و بابرکت بنالینا ہے جو بہت بڑی نعمت ہے، اس لئے کہ پاکیزہ مال کا استعمال پاکیزہ اخلاق واعمال کے وجود میں آنے کا ذریعہ ہے، یہ ذہن میں رہے کہ یہ حلال مال کی برکت ہے ورنہ حرام مال زکات نکال دینے سے پاک نہیں ہوجاتا۔

ایک طویل حدیث کے ضمن میں زکوٰۃ وصدقات سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا "صدقہ گناہوں کو اسی طرح بجھا دیتا ہے جیسے کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے"۔(ترمذی:2616)

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وصدقات جہنم کی آگ سے بچانے والے اعمال ہیں، اسی لئے آپ نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: دوزخ کی آگ سے بچو چاہے کھجور کی ایک پھانک خیرات کرکے ہی سہی"۔(بخاری:1417)

ایک حدیث میں ہے کہ" اگر تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی تو تم نے اپنے کو مال کے شر (یعنی نقصان) سے محفوظ کرلیا"۔(الترغیب والترھیب:1077)

ایک حدیث میں ہے کہ" تمہارے اسلام کی تکمیل یہ ہے کہ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو"۔(الترغیب والترھیب:1069)

ایک حدیث میں ہے کہ" اپنے مالوں کو زکوٰۃ ادا کرکے ضائع ہونے سے بچالو۔

(الترغیب والترھیب:1078)

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ" جب بھی کوئی شخص اپنے پاکیزہ مال میں سے کچھ صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اس صدقے کی اس طرح حفاظت اور پرورش کرتے رہتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی اونٹ کے بچے یا

درخت کے پودے کی حفاظت و پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے''۔(بخاری:1415)

ایک حدیث میں ہے کہ ''راہِ خدا میں دینا مال میں کمی نہیں کرتا''(مسلم:2588)

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ہو یا نفل صدقات کہنے کو تو خرچہ ہے اور دیکھنے میں مال کم ہوتا ہوا نظر آتا ہے مگر حقیقت یا انجام کے اعتبار سے اس میں کمی ہرگز نہیں ہوتی، یا تو اللہ تعالیٰ کسی بے گمان راستے سے ظاہری طور پر ہی مال بڑھا دیتے ہیں یا اس میں خاص قسم کی برکت دیدیتے ہیں، یا جن راستوں سے واقعی نقصان و کمی ہوسکتی تھی اس سے بچالیتے ہیں، بہرکیف یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کے لئے خرچ کئے گئے مال سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔ اہلُ اللہ کو اس کا خوب تجربہ ہے، بس وعدوں پر یقین شرط ہے۔

مذکورہ آیات واحادیث سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ زکوٰۃ وصدقات کی اسلام میں بہت اہمیت ہے، بہت تاکید کی گئی ہے، ہر جگہ اس کا حکم نماز کے ساتھ جوڑ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ خوب پتہ چل جائے کہ اس کا مقام نماز سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا ''اللہ کی قسم! جو لوگ صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کریں گے میں اُن سے ضرور جہاد کروں گا'' (بخاری: 1400) اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے احکام میں حکمتوں اور مصلحت پر پورا بھروسہ رکھتے ہوئے جی جان سے عمل کرنے والے بن جائیں۔ آمین

(ج)

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے نقصانات

جس طرح زکوٰۃ ادا کرنا بہت بڑا کارِ خیر اور دارین کی کامیابی کا وسیلہ ہے اسی طرح زکوٰۃ نہ ادا کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور دارین کی تباہی کا ذریعہ ہے، قرآن وحدیث میں اس کی سخت مذمت آئی ہے، ذیل میں چند آیات واحادیث پیش کی جارہی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (سورۂ فصلت:۶،۷)

تو بڑی بربادی ہے مشرکین کے لئے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، (حقیقت میں) یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں۔

دیکھئے! اس آیت میں کفار و مشرکین کی عادت کے حوالے سے زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے، جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ میں نمازیں ترک کرنے کو مشرکین کی مشابہت قرار دیا گیا ہے یہاں بھی زکوٰۃ نہ ادا کرنے کو مشرکین کا عمل قرار دیا گیا ہے جس سے اس کا نہایت مذموم عمل ہونا سمجھ میں آرہا ہے۔

دوسری جگہ منافقین کی خوش فہمی کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۂ ال عمران:۱۸۰)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اپنے فضل سے عطا کردہ مال میں بخل کر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ایسا کرنا ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ وہ تو ان کے حق میں سراسر شر ہے، (ویسے تو بالآخر) زمین وآسمان کا وارث اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس آیت میں تین باتیں مذکور ہیں، ایک یہ کہ تمام نعمتیں بہ شمول مال کے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ، دوسرے یہ کہ اللہ کے دئے ہوئے مال میں سے اللہ کے بندوں کو نہ دینا اور بخل سے کام لینا بڑی ناشکری اور احسان فراموشی ہے اور اوپر سے اس کو ہوشیاری اور کمال سمجھنا انتہائی کمینا پن کی بات ہے، ایسا کرنے میں تو کوئی بھلائی نہیں ہے برائی ہی بُرائی ہے۔ تیسرے یہ کہ لوگ مُلک و مال کی عارضی ملکیت پر خواہ کتنا ہی اپنا حق جتائیں اور چاہے کتنا ہی اٹھا کے چھپا کے رکھیں بالآخر زمین وآسمان کا خالق و مالک ہی اس کا مالک ہو جائے گا، بندوں کو سوچنا چاہیئے کہ مال جب اللہ ہی نے دیا اور اللہ ہی کو لوٹا دینا ہے تو اس کے کہنے سے اس کے بندوں پر خرچ کر کے حقیقی اور دائمی نعمتوں کے حق دار کیوں نہ

بن جائیں؟

جس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی اس کے انجامِ بد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (سورۂ توبہ:۳۵)

جس دن اس مال کو (جس کی زکوٰۃ نہیں دی گئی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ذریعے اس کے مالکوں کے چہروں، بازوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ مال جسے تم نے (زکوٰۃ ادا کئے بغیر) جوڑ جوڑ کے رکھا تھا تو اب اپنی ہی جمع پونجی کا مزہ چکھو۔

ذرا غور کیجئے کہ اس آیت میں کتنی سخت وعید اور اللہ تعالیٰ کی کیسی ناراضگی بیان کی گئی ہے، اگر ذرا بھی احساس زندہ ہوگا تو مومن کبھی ایسا گناہ نہیں کر سکے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ’’جو کوئی بھی سونے چاندی کا مالک ہو اور اس کا حق یعنی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن ضرور ایسا ہوگا کہ اس مال کی پلیٹیں تیار کی جائیں گی پھر ان کو آگ میں تپایا اور گرمایا جائے گا، پھر اس کے ذریعے اس کے چہرے کو، بازوؤں کو اور پیٹھ کو داغا جائے گا، جب یہ پلیٹیں ٹھنڈی ہو جائیں گی تو پھر سے اُن کو تپایا جائے گا، اور یہ معاملہ اس کے ساتھ اس دن ہوگا جس کی تعداد پچاس ہزار برس کی ہے، یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ تمام بندوں کے فیصلے مکمل نہ ہو جائیں، اس کے بعد وہ اپنا راستہ دیکھ لے گا یا تو جنت کی طرف یا جہنم کی جانب‘‘۔ صحابہؓ نے اس موقعہ پر آپ سے اونٹوں، بیل بکریوں کے بارے میں دریافت کیا تو ان کے بارے میں بھی تقریباً یہی تفصیل بتلائی گئی کہ اگر ان کی زکوٰۃ نہیں دی گئی تو وہ دنیا سے کہیں زیادہ پختہ اور فربہ شکل میں لائے جائیں گے اور ان سے ان کے مالکین کو رُندوایا جائے گا، جب سارے جانور اُسے روند چکیں گے تو پھر نئے سرے سے سلسلہ شروع ہوگا، اور یہ سلسلہ حساب کتاب کے ختم ہونے تک چلتا رہے گا،

پھر اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا''۔(بخاری:2860)

حدیث بالکل واضح ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ میں کوتاہی کا انجام دنیا میں مال کی بے برکتی اور نفس کی ناپاکی تو ہے، ہی برزخ و آخرت میں بھی سخت اذیت وتکلیف اور بدترین عذاب کا سبب ہے۔اعاذنا اللہ منہ۔

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کرتا قیامت کے دن وہ اس کے لئے ایک گنجا یعنی سخت زہریلا سانپ بن جائے گا، جسے اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا''۔(ابن ماجہ:1784)

ایک حدیث میں ہے کہ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مال داروں کے مال میں اتنی گنجائش رکھی ہے جس سے ناداروں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں، ناداروں کو جو کچھ کھانے پہننے کی ضرورتوں میں دشواریاں پیش آتی ہیں وہ سب مال داروں کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی وحق تلفی کی وجہ سے آتی ہیں، اچھی طرح سمجھ لو! اللہ تعالیٰ مال داروں سے اس حق تلفی کا سخت حساب لے گا اور دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا''(الترغیب والترہیب:1095)

ایک حدیث میں ہے کہ''جہنم میں سب سے پہلے داخل ہونے والے تین لوگ ہیں، ظالم حکمراں، محتاج متکبر، اور وہ صاحبِ گنجائش مال دار جو اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کا حق (یعنی زکوٰۃ وصدقات) نہیں نکالتا''(ترمذی:1042)

ایک حدیث میں ہے کہ''جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا بند کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو خشک سالی اور بارش کی کمی میں مبتلا فرما دیتے ہیں، اگر جانور نہ ہوتے تو ایسے لوگوں پر کبھی بارش نہ ہوتی''(ابن ماجہ:4019)

ظاہر ہے کہ پھر اس سے یعنی بارش نہ ہونے سے ساری معیشت متأثر ہو جاتی اور نظامِ زندگی خراب ہو جاتا ہے جو بہت بڑا نقصان اور سخت مصیبت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حرص وطمع سے بچو، کیوں کہ اسی مرض نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے، حرص وطمع نے انہیں بخل سکھایا تو وہ بخیل بنے، قطع رحمی سکھائی تو وہ قاطعِ رحم بن گئے اور

اس نے ان کو گناہ کے کاموں کی ترغیب دی تو وہ گناہوں میں مبتلا ہو گئے‘‘۔ (ابوداؤد:1698)

اس طرح حرص وطمع نے ان لوگوں کی دنیا اور آخرت برباد کر دی۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ و صدقات ادا نہ کرنے کا سبب شُحّ یعنی حرص وطمع ہے، اور حرص وطمع بدترین خصلت ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا: وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورۃ التغابن:۱۶)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک خاتون اپنی بچی کو گود لئے حاضر ہوئی، اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن تھے، آپ ﷺ نے اس خاتون سے دریافت کیا ’’کیا سونے کے اِن کڑوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟‘‘ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم پسند کروگی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان دونوں کڑوں کے عوض آگ کے دو کڑے تمہیں پہنا دے؟‘‘ اس خاتون نے یہ سُن کر فوراً وہ کڑے بچی کے ہاتھ سے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دئے اور کہا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔

(ابوداؤد:1563)

معلوم ہوا کہ جس زیور کی زکوٰۃ نہیں ادا کی جائے گی، قیامت کے روز اس کے عوض آگ کا زیور پہننا ہوگا، اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابیات کا ایمان ویقین اور نبی کریم ﷺ کی خبروں پر اطمینان وبھروسہ اس درجے کا تھا کہ اس اللہ کی بندی نے فوراً اس زیور ہی کو راہِ خدا میں خرچ کر دیا جس کی اس نے اب تک زکوٰۃ نہیں نکالی تھی، کیا مسلمان عورتیں آج اپنے نبی کی تعلیمات جان لینے کے بعد کم از کم اتنا بھی کر رہی ہیں کہ حساب کتاب کر کے آہستہ آہستہ ادا کر دینے کا ارادہ کر لیں، اگر ہماری بہنیں کم از کم لایعنی خواہشات میں صرف ہونے والا پیسہ روک لیں تو کسی سال کی زکوٰۃ باقی نہ رہے، بس اللہ تعالیٰ ہی سمجھ اور توفیق دے۔ آمین

(د)

عام صدقات کے فضائل

زکوٰۃ ایک خاص مقدار کے مالک ہونے اور اس پر ایک سال گذر جانے سے واجب

ہونے والا عمل ہے، ظاہر ہے کہ ہر کوئی مسلمان اتنے مال کا مالک نہیں ہوتا اور بہت سے تو نہایت غریب مسلمان ہوتے ہیں، بالخصوص غیر تاجر مردوں کے پاس عام طور سے جمع پونجی بہت ہی کم بلکہ نا کے درجے میں ہوتی ہے اور بہت سوں کا حال تو روز نیا روزی نئی والا حال ہوتا ہے تو کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اب اُن کے لئے صدقہ وخیرات کی کوئی ترغیب نہیں ہے یا کوئی صورت نہیں ہے، اسلام نے زکوٰۃ سے ہٹ کر بھی صدقہ وخیرات کی بہت ترغیب دی اور تاکید فرمائی ہے، بلکہ قرآن وحدیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صدقہ وخیرات معمولی مقدار ہی میں سہی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے اور اس کے قلیل وکثیر کسی حصے سے کسی مسلمان کو محروم نہیں رہنا چاہیئے یہ سلسلہ تاحیات چلتے رہنا چاہیئے، اس سے خود اس دنیا میں بڑی بڑی برکتوں کا حصول ہوتا ہے اور مرنے کے بعد تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں ایمان والوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (سورۃ البقرہ:۳)

اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ (سورۃ البقرہ:۲۶۱)

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے کی سی ہے جو سات بالیں اُگائے اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادہ اجر بڑھا دیتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سورۂ سبا:۳۹)

اور جو مال بھی تم (رضائے الٰہی کے لئے) خرچ کرو گے اس کو اللہ تعالیٰ تمہیں لوٹا دے گا اور اللہ تعالیٰ بہترین روزی رساں ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ کیسے لوٹائے، وہ اربوں کھربوں مخلوق کو روزی پہونچاتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ کس کس طریقے سے پہونچاتا ہے، اس لئے جب اس نے کہہ دیا کہ وہ اس کے راستے میں خرچ کئے گئے مال کو واپس دیدے گا تو دے کر رہے گا، آخرت میں تو اپنی شان کے مطابق خوب بڑھا کر چڑھا کر عطا کرے گا ہی، اس دنیا میں بھی انشاء اللہ کسی نہ کسی صورت میں بدلہ دے گا اور دیتا ہی رہتا ہے۔

ایک اور جگہ تو عمومی خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورۃ الذاریات:۱۹)	اور ان کے اموال میں مانگنے والے محتاج اور نہ مانگنے والے محتاج دونوں کا حق ہے۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ آپ نے فرمایا ''بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ اور حقوق بھی ہیں''۔ (ترمذی:659)

ایک حدیث میں ہے کہ ''ابنِ آدم! تو دوسروں پر خرچ کر تجھ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) خرچ کیا جائے گا'' (بخاری:5352)

معلوم ہوا کہ اپنے مال کو بڑھانے اور برکت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی صدقہ کرتا رہے، عام صدقات کی مقدار تو متعین ہے نہیں، اللہ جو دے اس میں سے کچھ محتاجوں پر بھی صرف کر دے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بنی آدم! تمہارے لئے اپنے ضرورت سے زائد مال کو (ضرورت مندوں میں) صرف کر دینا بہت خیر کی بات ہے، اور (بلاضرورت) روکے رکھنا بُری بات ہے، ہاں ضرورت بہ قدر اُٹھا کے رکھ سکتے ہو، اور اس خرچ کرنے میں ان کو مقدم رکھو جن کی ذمہ داری تمہارے اُوپر ہے، اور اُوپر والا (یعنی دینے والا) ہاتھ نیچے والے (یعنی لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ (مسلم:1036)

ایک حدیث میں ہے کہ ''بے شک صدقہ (وخیرات) رب تعالیٰ کے غصے کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بُری موت سے بچا لیتا ہے۔ (ترمذی:664)

ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن ـــ جب کہ ہر طرف دھوپ ہوگی ـــ آدمی کا سایہ اس کا صدقہ ہے'' (مسند احمد: ۱۴۱/۴) یعنی اس کے صدقات ابر بن کر اس کے سر پر سایہ فگن ہوجائیں گے اور دھوپ سے بچالیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''صدقہ خیرات اگر عام آدمی پر کیا جائے تو وہ ایک صدقہ ہے اور رشتے دار پر کیا جائے تو دوگنا اجر ہے، ایک صدقہ کا دوسرے صلہ رحمی کا''۔ (ترمذی: 658)

معلوم ہوا کہ اعزہ واقرباء کا خیال کرنا بھی راہِ خدا میں صرف کرنا ہی ہے، اس سے بھی صدقے کا اجر ملتا ہے، بلکہ بال بچوں پر اپنی ذمّے داری کے احساس کے ساتھ اور ثواب کی امید پر صرف کرنا بھی صدقہ ہے، یعنی قابلِ ثواب ہے اور لائق قبولیت عمل ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ کسی صحابیؓ نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دریافت کیا کہ میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ موت سے قبل کچھ کہہ سُن پاتیں تو صدقہ کرنے کی وصیت ضرور کرتیں، اب اگر میں اپنی طرف سے ان کے لئے صدقہ کروں تو انہیں اس کا اجر ملے گا؟ فرمایا ''ہاں! (بخاری: 1388)

ایک حدیث میں ہے کہ 'ایک بدکار عورت اس عمل پر بخش دی گئی کہ اس نے ایک پیاسے کُتے کو کیچڑ چاٹتا ہوا دیکھا تھا اس پر رحم کھا کر اپنے ڈوپٹے میں اپنا موزہ باندھ کر کنویں سے پانی نکالا اور اس کو پلایا؟ پوچھا گیا کہ ہمیں جانوروں کے ساتھ سلوک پر بھی اجر ملتا ہے؟ فرمایا: ''ہر ترجگر رکھنے والے یعنی ہر جانور سے بھلائی قابلِ اجر عمل ہے''۔ (بخاری: 3321)

ایک حدیث میں ہے کہ ''ہر روز صبح کو دو فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ! خرچ کرنے والے کو عطا فرما، دوسرا کہتا ہے اے اللہ! (بے ضرورت) روک کے رکھنے والے کو محروم فرما'' (بخاری: 1442)

بہ ہر حال مذکورہ آیات واحادیث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ صدقہ خیرات ایمان والوں کی صفت ہے، ایمان کا پھل ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کا سبب ہے، بلاؤں سے حفاظت ہے، انسانیت سے ہم دردی ہے، رشتہ داروں کے ساتھ بہتر سلوک ہے،

اللہ تعالیٰ کے غضب سے حفاظت ہے، جہنم سے بچاؤ ہے، قیامت کے دن کا سایہ ہے، عرش کے سائے میں جگہ دئے جانے کا سبب ہے وغیرہ بے شمار فوائد ہیں، اسی لئے امیر غریب سب پر صدقہ لازم کیا گیا ہے۔

اب جن کے پاس نصاب کے بہ قدر مال ہے وہ زکوٰۃ بھی دیں دیگر خیرات بھی کریں، اور جو کوئی صاحبِ نصاب نہیں ہے وہ حسبِ موقع نفل صدقات کرتے رہیں، جو خود محتاج ہیں وہ بھی تھوڑا بہت صدقہ کرتے رہیں، جو بالکل بھی اہل نہیں ہیں وہ جسمانی بھلائیوں اور افعالِ خیر کے ذریعہ صدقہ کریں، مثلاً غریبوں کے کاموں میں ہاتھ بٹا دینا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا، مصیبت زدہ سے ہم دردی کی باتیں کرنا اور مُسکرا کے مل لینا وغیرہ، مگر محروم کوئی نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے توفیق عمل نصیب فرمائے۔ آمین

۳

الصوم

روزہ

(الف)
روزہ کی تعریف وتحقیق

صوم اور **صیام** عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنیٰ تو کسی کام سے رُک جانے اور کسی مقام پر ٹھیر جانے کے ہیں، چوں کہ روزے میں آدمی کھانے پینے اور جماع سے رُک جاتا ہے اس لئے اس عمل کو **صوم** کہا جاتا ہے، **صوم** کی شرعی تعریف امام جُرجانیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ''صوم شریعت میں ایک خاص امساک سے عبارت ہے، اور وہ خاص امساک یعنی رُکنا صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع یعنی بیوی کے ساتھ صحبت سے رُکے رہنا ہے''۔ (التعریفات: ۱۴۱)

امام ابن قیمؒ روزے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روزہ متقیوں کے نفس) کی لگام، (اپنے نفس سے) مقابلہ کرنے والوں کی ڈھال، نیک اور مقرب بندوں کی (پسندیدہ) ریاضت ومجاہدہ ہے، روزہ دیگر تمام اعمال صالحہ کے مقابلے میں بہ طورِ خاص رب العالمین کے لئے ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ روزہ دار کچھ کرتا نہیں ہے، بس اپنے شہوانی تقاضے اور اپنا کھانا پینا اپنے معبود کی رضا جوئی اور طلب میں چھوڑ دیتا ہے، پس روزے کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت ورضا کی خاطر نفس کی مرغوبات اور لذّتوں کی قربانی ہے جو بندے اور اس کے خدا کے

درمیان ایسا راز ہوتا ہے جس سے اُن کے علاوہ کوئی اور واقف نہیں ہوتا، اس لئے کہ لوگ روزہ توڑنے والی ظاہری چیزوں سے بچنے سے اگر چہ واقف ہو سکتے ہیں مگر اس کا کھانا پینا اور بیوی سے دور رہنا ایسا مخفی عمل ہے جسے کوئی انسان نہیں جان سکتا بس یہی روزہ کی حقیقت ہے۔ اور روزے میں اعضائے ظاہرہ اور قوائے باطنہ کی حفاظت کی عجیب تاثیر موجود ہے، اسی طرح روزہ آدمی کے باطن کو ایسی چیزوں کے اختلاط سے جو اس کو فاسد اور خراب کرنے والی ہیں بچاتا ہے، اور اُن چیزوں کو باطن سے نکال پھینکتا ہے جو اس کی سلامتی کے لئے مضر ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ روزہ اعضائے ظاہرہ و باطنہ یعنی جسم اور روح دونوں کی صحت کا ضامن ہے، نیز خواہشاتِ نفسانیہ کے ہاتھوں لُٹی اور ضائع ہو چکی قوت کو واپس لاتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو روزہ یقیناً تقویٰ کے حصول میں سب سے زیادہ مددگار عبادت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی بن سکو''۔ (زادالمعاد: ۲/۲۹)

امام غزالیؒ روزہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: معلوم ہونا چاہئے کہ روزہ میں کچھ ایسی خصوصیت ہے جو دیگر اعمال میں نہیں ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا اس عمل کو اپنی ذاتِ عالی کی جانب منسوب کرنا جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا'' اور روزے کی فضیلت و شرف کے واسطے یہ اضافت ہی بہت کافی ہے جیسا کہ کعبے کو ''بَیْتِیْ یعنی میرا گھر کہہ کر اللہ تعالیٰ نے شرف و فضل بخشا ہے جو کسی اور گھر کو نصیب نہیں ہے، اسی طرح الصوم لی کہہ کر روزے کو بھی خاص شرف و فضل عطا فرمادیا۔ پھر روزے کی فضیلت کی دو وجہیں اور ہیں، ایک یہ کہ وہ ایک ایسا باطنی عمل اور بھید ہے جسے مخلوق دیکھ نہیں پاتی اس لئے اس میں رِیا کا دخل مشکل ہے، دوسرے یہ کہ وہ اللہ کے دشمن یعنی شیطانِ لعین پر حملہ اور غلبہ ہے، اس طور پر کہ شیطان کے بندے پر غالب آنے کا وسیلہ شہوات ہیں، اور شہوات کھانے پینے سے مضبوط ہوتے ہیں، پس جب شہوتوں کی زمین ہر بھری رہتی ہے تو شیاطین اس میں چرنے کے لئے خوب چکر کاٹتے رہتے ہیں، اور جب

روزہ دار روزہ رکھ کر بطن اور فرج کی شہوات کو ترک کر دیتا ہے اور خواہشات کی زمین خشک ہوجاتی ہے تو شیطان کی آمد ورفت اور دل چسپیاں ماند پڑ جاتی ہیں یہ بھی روزے کا خاص اثر ہے جو دوسرے اعمال سے ممتاز کرتا ہے۔ (ماخوذ از: مختصر منہاج القاصدین: ۴۴)

امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ روزہ اسلام کا تیسرا رُکن ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سی مصلحتوں کے تحت فرض فرمایا ہے، ان میں سے سب سے اہم مصلحت یہ ہے کہ روزہ نفس امّارہ کے سکون پانے اور اس کی شہوتوں کے ٹوٹنے کا سبب ہے، دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، یعنی نفسِ امارہ کا سکون اس کی شہوات کے ٹوٹنے پر موقوف ہے، اور شہوات نفس کا ٹوٹنا اس کے سکون پانے کا واحد ذریعہ ہے) جب آدمی روزہ رکھتا ہے تو بھوکا رہنا پڑتا ہے، اور بھوک نفس کی تمام فضول سرگرمیوں کو توڑ دیتی ہے، جب وہ ٹوٹ جاتی ہیں تو پھر تمام اعضا و جوارح — آنکھ، زبان، کان، شرم گاہ — سب قابو میں رہتے ہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب نفس بھوکا رہتا ہے تو تمام اعضاء شکم سیر رہتے ہیں اور جب نفس شکم سیر رہتا ہے تو تمام اعضا بھوکے پیاسے ہوجاتے ہیں۔ روزے کی برکت سے جب نفس بھوکا رہتا ہے اور بھوک کی وجہ سے اس کی لایعنی اور معاصی کی سرگرمیاں ٹھپ پڑ جاتی ہیں تو قلب تمام کدورات اور گندگیوں سے پاک ہوجاتا ہے، اس لئے کہ قلب کی تشویش اور گندگی کا سبب اعضا و جوارح سے سرزد ہونے والے بُرے اعمال ہیں، جب وہ رُک جائیں گے تو ظلمتِ قلب کم ہوگی اور تزکیہ وتصفیہ کا مقام حاصل ہوگا (پھر قلب تجلیاتِ ربانی کا محل بن جائے گا، ایک فائدہ تو روزے کا یہ ہوا جو بہت بڑا فائدہ ہے)۔

اس کے علاوہ روزہ غریبوں پر ترس کھانے اور رحم کرنے کا سبب بھی ہے، اس لئے کہ آدمی کو جب بھوک کی تکلیف کا احساس ہوگا تو اس تکلیف کو وہ بُھلا نہیں پائے گا، پھر اس احساس کی برکت سے جب بھی وہ کسی کو بھوکا پائے گا تو اس کے دل میں ہونے والی تکلیف کا اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی، فوراً اس کے حق میں رحمت وشفقت کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اس کی بھوک پیاس مٹانے کا سامان کر کے اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل حاصل کرلے گا۔

ایک فائدہ روزے کا یہ بھی ہے کہ روزہ دار کچھ دیر کے لئے فقراء ومساکین سے مشابہ ہوتا ہے، جس کی برکت سے وہ بھی عند اللہ محبوب وپسندیدہ بندوں کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

ملا علی قاریؒ ان کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض اہل اللہ کے حالات میں ہے کہ جب وہ کھانا کھاتے تو ہر نوالے پر غرباء وفقراء کو یاد کر کے یوں کہتے تھے ’’اے اللہ! محتاجوں کو بھوکا چھوڑ کر خود کھانا کھانے کو معاف فرما اور ہم سے ان کے حق کا مواخذہ نہ فرما‘‘ اور یہ بات بھی معتبر طریقے سے منقول ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام خشک سالی کے زمانے میں کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھاتے تھے تا کہ غرباء ومساکین فراموش نہ ہو جائیں، اور تا کہ فقر واحتیاج میں ان کی مشابہت ہو جائے، حالاں کہ اُن دنوں اُن کے پاس بے حساب مال ودولت اور اسبابِ رزق موجود تھے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۴/ ۳۸۵)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ میں روزے کی سلسلے میں ایک ایک جزیئے پر تفصیل سے کلام کر کے اس کی شرعی وعقلی مصلحتوں پر روشنی ڈالی ہے، اہل علم وہیں پر استفادہ کر لیں، ایک نکتہ خلاصے کے طور پر یہاں عرض کیا جا رہا ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی حکمت سے ملکوتیت (یعنی خالص نیکی کے مزاج) اور بہیمیت (یعنی خالص نفسانی ومن مانی کے مزاج) کا جامع بنایا ہے، اور اس کی سعادت وکامیابی اس پر رکھی ہے کہ وہ ملکوتیت کی صفت کو بہیمیت کی صفت پر غالب رکھے، یعنی اپنی نیک مزاجی کو اپنے حیوانی ونفسانی تقاضوں پر اس طرح غالب رکھے کہ نفس اور نفسانی تقاضے مغلوب اور مطیع ہو جائیں، لیکن فطری طور پر ایسا ہو نہیں پاتا، جس کی وجہ کھانے پینے اور شہوانی تقاضوں کی تکمیل کرتے رہنے سے حیوانی قوت کا مضبوط ہو جانا ہے، جب یہ بات ہے تو پھر اس کھانے پینے اور شہوانی تقاضوں میں لگے رہنے پر کنٹرول کرنا اور قابو پانا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ایسے لوگ جو حیوانی قوت کو کم زور کرنا چاہتے ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ نفس اور حیوانت کو قابو میں کرنے کے لئے بطن اور فرج یعنی پیٹ اور شرم گاہ کی لذتوں پر روک لگانا ضروری ہے، یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں (حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۱۶۹)

حاصل یہ ہے کہ طبعی تقاضوں کی شدت کو توڑ کر روحانی وملکوتی تقاضوں کو اُبھارنا روزے کا مقصد ہے۔

مذکورہ بالا تمام تفصیل سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اسلامی عبادات اہم حکمتوں پر مشتمل ہیں، خاص طور سے یہ روزے والا عمل تو بڑی بڑی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت مقرر کیا گیا ہے، اور اس میں انسانیت کا فائدہ ہی ہے، اس عمل سے دنیوی اعتبار سے بھی بہت سے فوائد مثلاً جسمانی وسماجی اور ظاہری و باطنی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور آخرت کے اجر وثواب کا تو کیا کہنا؟ اللہ تعالیٰ نے بہ طور خاص روزے کا اجر اپنے ذمّے لے رکھا ہے؛ اس لئے ہر مسلمان کو چاہیئے کہ روزے رکھنے کا اہتمام کرے محض ایک فریضہ سمجھ کر اور زبردستی نہیں بل کہ ایک فضیلت اور شرف ہونے کے حوالے سے بہت خوشی اور دل چسپی کے ساتھ رکھے، رمضان شریف کے فرض روزوں کے علاوہ سال بھر نفل روزوں کا بھی ممکن حد تک اہتمام کرے۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین

(ب)

روزے اور رمضان کے فضائل

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (سورۃ البقرہ: ۱۸۳)	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے بھی لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، امید ہے کہ (اس کی برکت سے) تم متقی بن جاؤ گے۔

ایک آیت کے بعد پھر ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (سورۃ البقرہ:۱۸۵)	رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُتارا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت کا سامان ہے اور ہدایت کی دلیلیں ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ہے، پس جو کوئی اس مہینے کو پائے تو لازم ہے کہ وہ روزہ رکھے۔

پہلی آیت کے ذریعہ روزوں کی فرضیت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزے اسی طرح یا کسی طرح پہلی امتوں پر بھی فرض تھے، شریعتوں میں جو چیزیں مشترک ہوتی ہیں وہ آسمانی تعلیمات کا بنیادی حصہ قرار دی جاتی ہیں، معلوم ہوا کہ روزہ بھی اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ روزہ متقی بننے کا وسیلہ ہے، آیت کے تحت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ روزے سے نفس کو اس کی (حلال) مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑ جائے گی تو پھر اس کو ان مرغوبات سے جو شرعاً حرام ہیں آسانی سے روک سکو گے، اور روزے سے نفس کی قوت و شہوت میں ضعف بھی آئے گا تو اب تم متقی ہو جاؤ گے، بڑی مصلحت روزے میں یہی ہے کہ سرکش نفس کی اصلاح ہو اور شریعت کے احکام جو تمہیں بھاری معلوم ہوتے ہیں ان کا کرنا سہل ہو جائے اور تم متقی بن جاؤ۔ (تفسیر عثمانی:۶۱)

دوسری آیت میں ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ رمضان المبارک کا مہینہ بہت بابرکت مہینہ ہے، اس کی برکت اور فضیلت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ اس مہینے میں قرآن کریم جیسا عظیم الشان کلامِ الٰہی کا نزول ہوا ہے، بلکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر آسمانی کتابیں بھی اسی مبارک مہینے میں اُتاری گئی ہیں، اسی وجہ سے اس مہینے میں جبرئیل علیہ السلام ہر سال آپ کے ساتھ قرآن کریم کا دور کرتے تھے یعنی دوبارہ سنا جاتے تھے، اور اسی وجہ سے اس مہینے میں وہ نماز رکھی گئی جس میں قرآن مجید پڑھا سنا جاتا ہے۔ یعنی تراویح

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب یہ اتنا مبارک مہینہ ہے اور اس میں بہت فضیلتیں ہیں،

اسی کے ساتھ اس میں روزہ فرض کیا گیا ہے تو پھر ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اس مہینے میں روزہ ضرور رکھے، روزے کے بجائے فدئے کی جو عارضی راحت ہے اس پر عمل کی کوشش نہ کرے وہ رعایت اب منسوخ ہے۔(تفسیرِ عثمانیؒ:۶۲)

یہ دو قرآنی آیات تھیں، رمضان اور روزہ دونوں کے فضائل کے سلسلے میں بہت سی احادیث بھی موجود ہیں، چند ایک ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''جب رمضان کریم شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ـــ ایک روایت کے مطابق رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ـــ جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، شیاطین زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں''۔(بخاری:1899)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ رمضان شریف کی یہ برکتیں صرف مسلمانوں کے حق میں ہوتی ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے، کیوں کہ اس مہینے میں غیر مسلمین اللہ کے شعائر یعنی روزہ اور قرآن سے کھلے عام بے احترامی کرتے پھرتے ہیں اس لئے وہ نسبتاً زیادہ محرومی کے شکار رہتے ہیں، مسلمان چوں کہ رمضان کے دنوں میں روزہ رکھتے اور راتوں میں نوافل کا اہتمام کرتے ہیں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو اس کی برکت سے ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کی تجلیات وانوار کے دریا میں غوطہ زن رہتے ہیں، ان کی دعائیں انہیں اپنی حفاظت میں لئے رہتی ہیں، ان کے انوار ایک دوسرے پر ضوفشاں رہتے ہیں، ان کی برکتیں پورے سماج پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد و ہمت کے مطابق نیکیوں سے قرب اور گناہوں سے بُعد اور دوری اختیار کرلیتا ہے تو اُن پر جنت کے دروازوں کا کُھل جانا اور جہنم کے دروازوں کا بند ہوجانا صادق آتا ہے، اس لئے کہ جنت کے دروازوں کے کُھلنے کی حقیقت رحمتِ الٰہی ہے اور جہنم کے دروازے بند ہونے کی حقیقت اس کی لعنت وغضب سے حفاظت ہے، اور یہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ اہل زمین کا اجتماعی طور پر کسی اچھے کام کا کرنا اس کے مناسب کسی انعامِ خداوندی کے حصول کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح شیاطین کا جکڑ دیا جانا اور فرشتوں کا روئے زمین پر پھیلا دیا جانا بھی مسلمانوں پر ہی صادق آتا ہے، اس طور پر کہ شیطان کا اثر اسی شخص پر ہوتا ہے جو اس کی راہ چلے اور اس کی راہ وہی چلتا ہے جو حیوانی تقاضوں سے مغلوب ہوتا ہے، رمضان میں جب کہ روزہ ونماز کی برکت سے مسلمانوں کے حیوانی جذبات مغلوب ہوجاتے ہیں تو وہ شیطانی اثر قبول کرنے سے بھی محفوظ ہوجاتے ہیں، نیز فرشتے اپنے جیسے لوگوں سے مانوس ہوتے ہیں یعنی ملکوتی صفات کے حاملین جو نیکی کے جذبات غالب رکھتے ہیں فرشتے ان سے قریب ہوتے ہیں، رمضان میں جب کہ روزے نماز کی پابندی اور گناہوں سے اجتناب کی برکت سے مسلمانوں میں فرشتہ پن غالب ہوجاتا ہے تو فرشتے بھی اُن میں گھل مل جاتے ہیں، یہ بات بھی ہے کہ رمضان میں چوں کہ اس رات کے وقوع کا امکان ہے جس میں تمام اہم اُمور فیصلہ کئے جاتے ہیں تو آسمانی انوار کا پھیل جانا اور اندھیروں کا چھٹ جانا بھی لازم ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۷۵، ۱۷۶)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص رمضان المبارک کے مہینے میں ایمان واحتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں، اور جو شخص رمضان (کی راتوں) میں قیام (یعنی تراویح اور دیگر نفل نمازوں کا اہتمام) کرے اس کے (بھی) پچھلے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں، اور جو شخص لیلۃ القدر میں قیام (یعنی دعا وعبادت کا اہتمام) کرے اس کے (بھی) پچھلے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں'' (بخاری: 1901)

حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ روزہ گناہوں کا کفارہ ہے، دوسرے یہ کہ رمضان کے مبارک مہینے میں صرف روزہ ہی رکھنا نہیں ہے بلکہ قیامِ لیل یعنی تراویح وتہجد اور ہوسکے تو دیگر نوافل کا بھی اہتمام کرنا ہے، تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اعمال صالحہ کے قبول ومؤثر ہونے کے لئے اُن کے اندر ایمان اور احتساب کی جان ڈالنا بھی ضروری ہے، ایمان سے مراد اس عمل کے عبادت ہونے کا یقین ہے اور احتساب کا مفہوم ثواب کی اُمید ہے۔
ایک بات اور یہاں ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ جو اعمالِ صالحہ پر گناہوں کی بخشش کا وعدہ ہوتا ہے ان سے ذُنوب اور سیأت یعنی چھوٹے گناہ مراد ہوتے ہیں اور جو گناہ کبائر ہیں یعنی اُن

پر سخت وعیدیں آئی ہیں اُن کی معافی کے لئے اگر وہ گناہ حق اللہ سے متعلق ہیں تو توبہ ضروری ہے اور اگر حق العبد سے متعلق ہے تو پھر توبہ کے علاوہ بندے سے معاملے کی صفائی بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، ان میں سے ایک کا نام ''ریّان'' ہے، اس سے صرف روزے دار ہی داخل ہو سکتے ہیں''۔ (بخاری: 3257)

ریّان کے معنیٰ ہیں ''سیراب کرنے والا'' چوں کہ روزہ دار دنیا میں گرمی سردی ہر حال میں پیاس کی شدت کو رضائے الٰہی کی خاطر برداشت کرتا رہتا ہے اس لئے آخرت میں اس کا یہ خصوصی اعزاز کیا جائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''بنی آدم کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے، ایک نیکی دس گُنا سے سات سو گُنا تک بڑھائی جاتی ہے (لیکن روزے کے بارے میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''سوائے روزے کے کہ وہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا (ضابطے سے ہٹ کر اپنی شان کے مطابق) دوں گا، بندہ اپنا کھانا پینا اور شہوت کو خاص میرے لئے چھوڑ دیتا ہے'' روزے دار کے لئے دو (خاص) خوشیاں ہیں ایک خوشی تو افطار یا عید الفطر کے موقع پر (اسی دنیا میں) مل جاتی ہے اور ایک خوشی جب وہ (قیامت میں) اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگا تب ملے گی'' (بخاری: 1904)

ایک حدیث میں ہے کہ روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے، روزہ کہے گا اے پروردگار! میں نے اس کو دن تمام کھانے اور خواہش نفسانی پوری کرنے سے روکے رکھا تھا تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما، اور قرآن کہے گا میں نے اس کو (راتوں میں) سونے سے روکے رکھا تھا تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، چناں چہ دونوں کی سفارش قبول کر لی جائے گی'' (شعب الایمان: 1994)

ایک حدیث میں ہے کہ جب رمضان شروع ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: ''یہ مہینہ شروع ہو چکا ہے، اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس رات

کی برکات سے محروم ہوا وہ ہر خیر سے محروم ہوا (بلکہ) اس رات کے خیر سے وہی محروم رکھا جاتا ہے جو سراسر محروم ہے''۔(ابن ماجہ:1644)

ایک حدیث میں ہے کہ''رمضان کی آخری رات کو میری امت کی مغفرت کر دی جاتی ہے''کسی نے معلوم کیا کہ آخری رات سے مراد شبِ قدر ہے؟ فرمایا نہیں! مزدور کو مزدوری تب ہی ملتی ہے جب وہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے''۔(مسند احمد: ۲/ ۲۹۲) یعنی یہ لیلۃ القدر نہیں رمضان کی آخری رات ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ''کسی شخص نے روزہ رکھ کر بھی دروغ گوئی اور اس پر عمل کو نہیں چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔(بخاری:1903)

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص رمضان میں بلا عذر شرعی کے اور بہ غیر کسی بیماری کے روزہ نہیں رکھا تو وہ اس کی تلافی کسی طرح نہیں کر سکتا، چاہے عمر بھر اس کے بدلے روزے رکھتا رہے۔(ابوداؤد:2396)

(ج)
نفل روزوں کے فضائل

رمضان المبارک کے روزے تو فرض عین ہیں، بنا کسی عذر شرعی وطبعی کے ان کا چھوڑنا جائز نہیں، ہر عاقل بالغ، مرد وعورت سب ہی مسلمانوں کے روزے رکھنا ہے، اِن فرض روزوں سے ہٹ کر جب چاہیں نفل روزے بھی رکھ سکتے ہیں اور رکھنا چاہیئے، کیوں کہ جب روزہ اتنا زیادہ پسندیدہ عمل ہے اور اس کا اجر بھی اللہ تعالیٰ خود اپنی جانب سے عام ضابطے سے ہٹ کر عطا فرماتے ہیں تو ایسے مبارک عمل کو جتنا بھی کیا جائے کم ہے، نفل روزے یوں تو اصولی اعتبار سے سال میں صرف پانچ دنوں ـــــ یعنی عید الفطر، عید الاضحیٰ اور اس کے بعد کے تین دن ـــــ کو چھوڑ کر سال بھر جب چاہے رکھ سکتے ہیں لیکن احادیثِ مبارکہ سے چند خاص موقعوں پر روزہ رکھنے کی خاص فضیلت بھی آئی ہے، ذیل میں انہیں حدیثوں کو نقل کیا جا رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں پورا مہینہ روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، اور شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں بہ کثرت روزہ رکھتے نہیں دیکھا''۔ (بخاری:1969)

معلوم ہوا کہ شعبان کے مہینے میں نفل روزے رکھنا بہت ثواب کی بات ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص رمضان کے روزے مکمل کرنے کے بعد شوال کے مہینے میں چھ روزے اور رکھ لے تو گویا اس نے پورے سال روزے رکھ لئے''۔ (مسلم:1164) یعنی اُسے چھتیس روزوں کے عوض تین سو ساٹھ روزوں کا اجر ملے گا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا عام دستور ایک نیکی کو دس گُنا کر کے قبول کرنے کا ہے۔ اور اگر کبھی رمضان اُنتیس دن کا ہو تو بھی اللہ کے نزدیک تیس ہی شمار ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل روزے اللہ تعالیٰ کے مہینے یعنی مُحرّم کے روزے ہیں''۔ (مسلم:1163) اللہ تعالیٰ کا مہینہ کہہ کر ماہِ محرم کی فضیلت بھی بتلا دی۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رمضان کے روزوں اور دسویں محرم کے روزے کا اہتمام فرماتے تھے اتنا اہتمام کسی اور روزے کا نہ فرماتے تھے''۔ (بخاری:2006)

ایک حدیث میں ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر ماہ تین روزے ضرور رکھا کرتے تھے''۔ (مسلم:1160)

ان تین روزوں کے بارے میں دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تھا کہ ''اگر تمہیں مہینے کے تین دن روزے رکھنا ہے تو (چاند کے اعتبار سے) تیرہ، چودہ، اور پندرہ تاریخ کو رکھ لیا کرو''۔ (ترمذی:761)

ایک اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''ایسا کرنا سال بھر روزہ رکھنے کے برابر ہے''۔ (ابوداؤد:2449)

ایک حدیث میں ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھا کرتے

تھے، جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا ''اللہ تعالیٰ پیر اور جمعرات کو اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے ان دو بندوں کے جو آپس میں قطع تعلق کیئے ہوئے ہوں ان کی مغفرت کے بارے میں فرماتے ہیں، ابھی رہنے دو جب تک کہ وہ آپس میں صلح نہ کرلیں۔

(ابن ماجہ:1745)

ایک حدیث میں ہے کہ ''کسی دن بندوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب نہیں جتنا کہ ذی الحجہ کے پہلے عشرے کی عبادت محبوب ہے اس عشرے کے (ابتدائی نو دنوں) کا ایک ایک روزہ سال بھر روزہ رکھنے کے برابر ہے اور ایک ایک رات کی عبادت شبِ قدر کی عبادت کے برابر ہے''۔ (ترمذی:758)

ایک حدیث میں ہے کہ عرفے کے دن یعنی ذی الحجہ کی نویں تاریخ کا روزہ گذشتہ ایک سال اور ایک سال آئندہ کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''۔ (ترمذی:749)

بعض احادیث میں نفل روزوں کی مطلقاً فضیلت بھی بتائی گئی ہے مثلاً ارشاد ہے کہ ''ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے (یعنی اس کو پاک کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے) اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے''۔

(ابن ماجہ:1745)

خلاصہ یہ ہے کہ نفل روزوں کی بھی بڑی فضیلت آئی ہے، زندگی آخرت بنانے کے واسطے ہے اس لئے آدمی سے جس قدر ممکن ہو اعمالِ صالحہ بالخصوص نفل روزوں کا اہتمام کرے، روزہ رکھنے کے لئے تو کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا، روزہ تو نہ کرنے کے کاموں کا مجموعہ ہے ہاں ایک نیت کرنی ہوتی ہے تو وہ سب سے آسان کام ہے۔

البتہ نفل روزہ رکھنے میں اس کا لحاظ رہے کہ ؁۱ مسلسل نہ رکھے۔ ؁۲ خاص جمعہ کے دن نہ رکھے درمیان میں جمعہ آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ ؁۳ رمضان سے ایک آدھ دن قبل نہ رکھے۔ ؁۴ عید الفطر، عید الاضحیٰ اور اس کے بعد تین دنوں میں نہ رکھے۔ ؁۵ اسی طرح حاجی کے لئے بہتر ہے کہ عرفے کے دن نہ رکھے۔ ؁۶ عورت بنا شوہر سے پوچھے نہ رکھے۔

محدثین اور فقہاء کا معمول ہے کہ وہ کتاب الصوم کے تحت رمضان سے متعلق چند اور

مضامین بھی بیان کردیتے ہیں، مثلاً عشرۂ اخیرہ کے فضائل، شب قدر کی فضیلت اور اعتکاف کی فضیلت اور قیامِ لیل یعنی تراویح وتہجد کا ذکر، اس لئے ایک ایک حدیث ان کی بھی یہاں شامل کی جارہی ہے۔

راتوں کے قیام یعنی نوافل جنہیں تراویح کہا جاتا ہے اس کا ذکر بالکل شروع میں آچکا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''جو شخص رمضان کی راتوں میں قیام کرے یعنی نوافل پڑھے اس کے پچھلے گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے''۔(بخاری:1901)

علماء فرماتے ہیں کہ اس قیامِ لیل سے تہجد مراد نہیں وہ تو سال بھر پڑھی جانے والی نفل ہے بہ طورِ خاص رمضان کی راتوں میں اس کے علاوہ نوافل ہیں جو اب تراویح کے نام سے ادا کی جاتی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول شریف یہ تھا کہ آپ رمضان شریف کے آخری دس دنوں میں اور زیادہ عبادت فرمایا کرتے تھے، کمر کس لیتے تھے، رات بھر عبادت کرتے تھے، اور گھر والوں کو بھی بیدار رکھتے تھے''۔(بخاری:2024)

جہاں تک شبِ قدر کا معاملہ ہے تو اس کے سلسلے میں یہ ایک حدیث بہت کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''جو شب قدر سے محروم ہوا وہ ہر خیر سے محروم ہوا اور شبِ قدر سے محرومُ القسمت ہی محروم رہتا ہے''۔(ابن ماجہ:1644)

اعتکاف کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''معتکف گناہوں سے محفوظ ہوجاتا ہے، وہ اعتکاف کی وجہ سے جو نیک کام (جیسے بیمار کی عیادت، خدمت خلق، جنازوں میں شرکت وغیرہ) نہیں کرپاتا ہے ان سب کاموں کا اُسے اجر ملتا ہے''۔(ابن ماجہ:1781)

یہی وجہ ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی رمضان کے عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف ناغہ نہیں فرمایا ہے۔(بخاری:2026)

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو رمضان المبارک اور اس سے متعلق اعمالِ صالحہ پر خوب ذوق وشوق سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

(۴)

الحج والعمرة

حج اور عمرہ

(الف)
حج وعمرہ کی تعریف وتحقیق

حج کے لغوی معنیٰ قصد یعنی ارادہ کرنا ہے اور اصطلاحِ شریعت میں جذبۂ احترام کے ساتھ مخصوص آداب واعمال کی رعایت کرتے ہوئے بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ کرنے کو حج کہتے ہیں۔

عمرہ زیارت اور کسی گھر کی آبادی وتحفظ کے مفہوم میں ہے لیکن شرعی اصطلاح میں حج کی طرح کا ایک خاص عمل ہے جو چند آداب وشرائط کے ساتھ حرم مکہ میں ادا کیا جاتا ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ وہ چھوٹا حج ہے، اسی لئے حج کو اس کے مقابلے میں حجِ اکبر بھی کہتے ہیں۔

حج وعمرہ بہت خاص اعمال میں سے ہیں، حج استطاعت کی شرط کے ساتھ زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے، اس سے زیادہ جتنی اللہ توفیق دے سعادت وشرف کی بات ہے، اس میں مال کا خرچ ہونا اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے، اس کو مال کا ضیاع نہ سمجھنا چاہیئے، عورتوں کے حق میں تو حج جہاد کے قائم مقام بھی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حج کے فرض ہونے کی مصلحتوں پر کلام کرتے ہوئے ۷ر باتیں بیان کی ہیں:

۱؎ بیت اللہ کی تعظیم جو کہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے، جب کہ بیت اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے۔ ۲؎ بارگاہِ الٰہی کا سالانہ اجتماع۔ ۳؎ اپنے توحید پرست اور دین حنیف کے متبع ہونے کا اعلان۔ ۴؎ مشرکین نے دینِ حنیفی میں اپنی طرف سے جو کمی زیادتی کردی تھی اُن کی اصلاح۔ ۵؎ مشرکین نے جو بدعقیدگیاں گڑھ لی تھیں اُن کا ازالہ۔ ۶؎ حضرت ابراھیم واسماعیل علیہما السلام جن سے دین حنیفی عربوں میں عام ہوا اُن کے اعمال ورسوم کا اتباع وتحفظ۔ ۷؎ تمام مسلمانوں کو ایک حال پر جمع کرنا۔ یہ سات باتیں صرف عنوان ہیں، شاہ صاحبؒ نے ان میں سے ہر ایک مصلحت ومنفعت کو کتاب وسنت اور عقلِ سلیم کی روشنی میں مدلل طور پر بیان فرمایا ہے، اہل علم اُن کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ جلال و جبروت اور قہر وغلبے والا ہے، شہنشاہ اور احکم الحاکمین ہے اور ہم اس کے عاجز ومحتاج اور محکوم بندے ہیں، (اسی طرح اللہ تعالیٰ کی) ایک شان یہ ہے کہ وہ ان تمام صفاتِ جمالیہ سے متصف ہے جو کسی سے محبت کا سبب ہوتے ہیں، یعنی وہ ہمارا حاکم اعلیٰ بھی ہے اور محبوبِ حقیقی بھی! پہلی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ بندے اس کے سامنے سراپا نیاز وادب بن کر حاضر ہوں اس کے لئے اسلام میں نماز اور زکوۃ جیسی عبادتیں رکھی گئی ہیں اور دوسری شان کا تقاضہ محبت اور والہیت کے تعلق کا اظہار ہے، روزہ اور حج ان تقاضوں کا مظہر ہیں، بالخصوص حج کی سب ادائیں ایک عاشقِ زار کا حال ہیں ان سب اداؤں اور رسومِ عاشقی کے بانی گویا سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں، یہ ادائیں اللہ تعالیٰ کو اتنی بھائیں اور پسند آئیں کہ دینِ اسلام میں ان کو حج وعمرہ کے آداب ومناسک بنادیا گیا۔ (معارف الحدیث؛ ۴/۷ ۹ ۳۔ خلاصہ کلام)

ملاعلی قاریؒ ''معالم التنزیل'' کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے ٹھیک نیچے ایک گھر بنایا اس کا نام ''بیت المعمور'' ہے، آسمان والے فرشتوں کو اس کا طواف کرتے رہنے کا حکم دیا (جیسا کہ خود عرش کا بھی مخصوص فرشتے طواف کرتے رہتے ہیں،

پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو بیت المعمور کے ٹھیک نیچے اور اسی کے مطابق ایک گھر بنانے کا حکم دیا تو فرشتوں نے (مکہ مکرمہ) میں بیت اللہ کی تعمیر کی، پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ جس طرح اہل آسمان ''بیت المعمور'' کا طواف کرتے رہتے ہیں اسی طرح اہل زمین ''بیت اللہ'' کا طواف کرتے رہیں، (اس کی تعمیر سے متعلق) مروی ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار (یا سات ہزار) برس پہلے کر دی تھی، پھر جب آدم علیہ السلام زمین پر اُتارے گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کا ارادہ کیا اور حج ادا کیا، فرشتوں نے ان سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حج مبرور فرمائے، ہم دو ہزار برس سے حج کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہندوستان سے مکہ مکرمہ پیدل پہونچ کر چالیس حج ادا کئے۔

اس وقت سے اب تک تمام شریعتوں میں حج کا حکم موجود ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حج سابقہ شریعتوں میں فرض تھا یا نہیں، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کے فرض ہونے میں انبیاء علیہم السلام اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت خاص ہے، پچھلی امتوں پر فرض نہیں کیا گیا تھا، فضیلت کے درجے ہی میں تھا، بہ ہر حال: حج امتِ مسلمہ (کے اہل استطاعت) پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے ذریعہ فرض کیا گیا ہے، اس کا انکار بالاجماع اور بلا اختلاف کفر ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۵/۴۱۹)

حج اس قدر مقبول ومحبوب عمل ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مرنے کے بعد بھی برزخ میں ان کو جو خاص زندگی حاصل ہے اس کی برکت سے حج بیت اللہ میں شریک ہوتے ہیں جیسا کہ احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے سفر میں مکے کے قریب مقام عُسفان میں حضرتِ ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو سُرخ رنگ کے جوان اونٹوں پر اُون کی چادروں میں ملبوس تلبیہ پڑھتے ہوئے حرم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

(مسند احمد: ۱/ ۲۱۵)

اور وادی ازرق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ کانوں میں انگلیاں رکھ کر تلبیہ پڑھتے ہوئے حرم شریف کی طرف جارہے ہیں۔(مسلم:۱/۱۵۲) اور ھرشیٰ نامی پہاڑیوں میں سے حضرت یونس علیہ السلام کو سرخ اور پُر گوشت اونٹنی پر سوار گذرتے ہوئے دیکھا وہ اونی جبّہ پہنے تلبیہ پڑھتے حرم کی طرف جارہے تھے۔(مسلم:18)

معلوم ہوا کہ حج ایک عظیم اور مقبول ترین عبادت اور رضائے الٰہی و قربِ خداوندی کا بہترین ذریعہ ہے۔

حج ہجرت کے نویں سال فرض ہوا، اس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ہونے والے جانشین و خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں مسلمانوں کا پہلا قافلۂ حج روانہ فرمایا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج کر دورانِ حج اعلان کروایا کہ اگلے سال سے کوئی بھی مشرک حج میں شریک نہیں ہو سکے گا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مشرکین سے بری ہیں۔ پھر اگلے سال یعنی ہجرت کے دسویں سال خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلانِ عام کے ساتھ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد کو لے کر فریضہ حج ادا فرمایا، نوّے ہزار یا اس سے بھی کہیں زیادہ مسلمان اس حج میں آپ کے ساتھ تھے، آپ نے ہر موقع پر پوری صراحت و صفائی سے اسلامی وحنیفی حج کا صحیح طریقہ مسلمانوں کو سکھایا، بنیادی احکام اور انسانی حقوق کا مقام واضح فرماتے رہے، حج کے کچھ ہی عرصے بعد آپ نے اس دنیا سے آخرت کی طرف سفر فرمالیا، اسی وجہ سے حج کو اسلام کا آخری اور تکمیلی رُکن کہا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حج ارکانِ اسلام اور اس کے بنیادی احکام میں سے ایک حکم ہے، عمر بھر کی عبادت، اختتامی امر، اسلام کی تکمیل، اور دین کا کمال ہے، پس ہر حج اور عمرے کا ارادہ رکھنے والے پر لازم ہے کہ جب حج وعمرہ کرنا چاہے تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی سچی توبہ کرے، لوگوں کی جو حق تلفیاں کی ہیں ان کی تلافی کرے، قرضے ادا کردے، امانتیں لوٹا دے، جن لوگوں کی کفالت اس کے ذمّے ہے حج سے واپسی تک کا ان کا خرچ جمع کرلے، سفر میں اپنی آمد ورفت اور وہاں کے قیام کے دوران کے ضروری اخراجات

ساتھ میں رکھ لے، دورانِ سفر سہولت اور راحت کی خاطر ایسے ساتھی کا انتخاب کر لے جو محبت کرنے والا، نیکوکار و مددگار ہو، اور کوئی ضرورت پڑے تو مدد کر سکے، ہمت ٹوٹے تو ہمت باندھ سکے، اگر کسی کام سے عاجز ہو تو تقویت کا سبب بنے اور اگر کبھی تنگ دلی و مایوسی کی نوبت آئے تو صبر و ثبات کی تلقین کر سکے۔ (احیاء علوم الدین: ۱/ ۳۲۴)

(ب)

حج وعمرہ کے فضائل وفوائد

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حج کو فرض کرتے ہوئے فرمارہے ہیں:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (سورۃ آل عمران: ۹۶، ۹۷)

بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لئے مقرر کیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، (یہ گھر) برکت والا ہے اور دنیا بھر کے لئے ہدایت ہے اس میں کھلی نشانیاں ہیں (جیسے) مقامِ ابراھیم اور جو اس میں داخل ہوا امن پا گیا، اور اللہ کا لوگوں پر حق ہے (اس) گھر کی زیارت (یعنی حج کرنا) جس کے پاس بھی اس کی گنجائش ہو، اور جو کوئی نہ مانے تو پھر اللہ تمام جہاں والوں سے بے نیاز ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ ''اس پاک گھر میں جمالِ خداوندی کی کوئی تجلی ہے، جس کی وجہ سے حج کے واسطے اس گھر کو متعین کیا گیا،، کیوں کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کی ہر ادا اللہ تعالیٰ کی خوب صورت ہستی کے عشق و محبت کا اظہار کرتی ہے، اس لئے جس کو بھی

اس محبوب ذات کی محبت کا دعویٰ ہے اور بدنی و مالی حیثیت سے بیت اللہ تک پہونچ بھی سکتا ہے تو وہ کم از کم (پوری) عمر میں ایک مرتبہ تو دیارِ محبوب میں حاضری دے اور وہاں کا چکر لگائے، اور اگر کوئی محبتِ (الٰہی کا دعوے دار (محبوب کے لئے) اتنی تکلیف اُٹھانا بھی گوارا نہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ اپنے دعوئے محبت میں جھوٹا ہے، اس جھوٹے عاشق کی مرضی ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے اور دھکّے کھاتا پھرے خود ہی محروم اور دور رہے گا، محبوبِ حقیقی کو کسی کی کیا پرواہے، کوئی یہودی ہو کر مرے یا عیسائی بن کر اس کا کیا بگڑتا ہے؟۔(تفسیر عثمانی:۷۔۱۴)

کعبۂ شریف کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے لئے اعلانِ عام کا حکم دیتے ہوئے فرمارہے ہیں:

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (سورۃ الحج:۲۷)

اور لوگوں میں حج کے لئے اعلانِ عام کر دیجئے، لوگ کھنچے چلے آئیں گے لمبے رستے طئے کرتے ہوئے پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر۔

یعنی عشاقِ خدا مسافت کی نزدیکی دوری کی پرواکئے بغیر بیت اللہ کی زیارت اور حج کے مناسک ورسوم ادا کرنے کے لئے چل پڑیں گے، دُبلی اونٹیوں سے مراد یا تو اُن کے طویل سفر طئے کرنے کی وجہ سے کم زور ہو جانا ہے یا پھر غریبوں کی سواریوں کی طرف اشارہ ہے کہ اُن کے پاس ہوتے ہی لاغر و کم زور جانور مگر اُن کا عشق انہیں کسی طرح حرم محترم تک لے آتا ہے اور خدائے مہربان کا مہمان بناتا ہے۔ آج بھی سفر کی جدید ترین سہولتوں کے باوجود سفر حج کوئی آسان کام نہیں تاہم ایمان والوں کے لئے وہ اس قدر آسان ہو جاتا ہے کہ کیا امیر کیا غریب، کیا تن درست کیا مریض، کیا حاکم و امیر کیا گدا و فقیر، سب ہی مست و مگن اور شاداں و فرحاں اُسی محبوب کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں، کوئی خوشی سے جھوم اُٹھتا ہے کوئی ندامت سے سرنگوں اور اشک بار دکھائی دیتا ہے، رزقنا اللہ وایاکم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب افضل ترین عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان، پھر جہاد، اور اس کے بعد حج مبرور یعنی مقبول حج، مشرق و مغرب تک تمام اعمالِ صالحہ پر فضیلت رکھتا ہے''۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، لا الٰہ اللہ محمد رّسول اللہ کی شہادت، نمازوں کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج اور رمضان شریف کے روزے''۔ (بخاری:8)

ایک حدیث میں ہے کہ ''حج اس سے قبل کئے گئے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔''

(مسلم:121)

ایک حدیث میں ہے کہ ''حج اور عمرہ ایک ساتھ یا پے در پے کیا کرو اس لئے کہ ان کا ایک ساتھ ہونا یا بار بار ہونا محتاجی اور گناہ دونوں کو دور کر دیتا ہے جیسا کہ بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے''۔ (ابن ماجہ:2887)

ایک حدیث میں ہے کہ ''حج مبرور کا بدلہ سوائے جنت کے اور کچھ نہیں'' پوچھا گیا کہ حج مبرور کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا: (ضرورت مندوں کو) ''کھانا کھلانے اور اچھی گفتگو کرنے سے''

(مسند احمد: ۱/۳۲۵)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا ''اے اللہ! حاجی کی مغفرت فرما اور اس کی بھی مغفرت فرما جس کے لئے حاجی دعائے مغفرت کرے''۔

(حاکم:1612)

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے''۔ (بخاری:1773)

حج مبرور، حجِ مقبول کو کہتے ہیں، حجِ مقبول وہ ہے جس میں ریا کاری نہ کی گئی ہو اور گناہوں کو شامل ہونے نہ دیا گیا ہو اور نہ اس میں گناہ و جماع کی باتیں کی گئی ہوں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں پر حج فرض کیا ہے، پس حج کیا کرو'، ایک صحابیؓ نے خوشی کے مارے عرض کیا:

یارسول اللہ! کیا حج ہر سال فرض کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ چُپ رہے، ان صحابیؓ نے یہ سوال تین مرتبہ دُہرایا، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال ہی فرض ہوجاتا پھر تم سے یہ فریضہ پورا نہ ہو پاتا''۔(بخاری:7288)

یعنی جیسے ان صحابہؓ کو یہ عمل اتنا محبوب تھا کہ بہ ظاہر وہ یہی چاہتے تھے کہ ہر سال کے لئے یہ حکم ہوتا، ویسے ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو بھی یہی پسند تھا، اگر نبی ﷺ ان کی پسند کو دیکھ کر ذرا بھی حامی بھر لیتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُسے سالانہ فریضہ بنا دیتے مگر نبی پاک ﷺ کے سامنے صرف صحابہ کرامؓ ہی نہیں تھے، قیامت تک کے ایمان والے بھی ملحوظِ خاطر تھے، آپ نے لوگوں کی مشقت کا خیال کیا اور خاموشی اختیار کرلی، پھر جب حکم کو قطعیت حاصل ہوگئی تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو تنبیہ فرمائی کہ یہ دین کی تکمیل کا زمانہ ہے ''زیادہ سوالات مت کرو پچھلے زمانے کے لوگوں نے یوں ہی اپنے اوپر پابندیاں بڑھائیں پھر نباہ نہیں سکے اور ہلاک ہوگئے'' (ایضاً) اور آج دیکھ لیں کہ عمر بھر میں ایک دفعہ فرض ہونے اور نہایت عاشقانہ عمل ہونے کے باوجود امت کے لاکھوں مال دار اس سے محروم ہیں، اگر ہر سال فرض ہوتا تو اس عمل کے تارکین کی کتنی تعداد ہوجاتی ؟۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''حاجی دورانِ حج جو بھی تسبیح تکبیر اور تہلیل پڑھتا ہے (یعنی اللہ کا ذکر کرتا ہے) ہر کلمۂ ذکر پر اس کو جنت کی خوش خبری سنائی جاتی ہے'' (الترغیب والترہیب:1608)

ایک حدیث میں ہے کہ ''لوگو! حج کرو، کیوں کہ حج گناہوں کو اسی طرح دھودیتا ہے جیسا کہ پانی میل کچیل کو دھودیتا ہے'' (الترغیب والترہیب:1619)

ایک حدیث میں ہے کہ ''حاجی کی سواری جتنے قدم اُٹھاتی اور رکھتی ہے ہر ہر قدم کے عوض اللہ تعالیٰ ایک نیکی لکھتا ہے اور ایک گناہ کو مٹاتا ہے اور ایک درجہ بلند کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بیت اللہ پہونچ جائے''۔(الترغیب والترہیب:1622)

ایک حدیث میں ہے کہ حج کو ادا کرنے میں جو اخراجات ہوتے ہیں وہ جہاد میں کئے جانے والے اخراجات کی طرح سات سو گنا کردئے جاتے ہیں'' (فیض القدیر:9323)

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص بیت اللہ کی زیارت کے لئے (یعنی حج کے لئے) آیا اور (اس دوران) نہ فحش باتیں کیں نہ گناہ کے کام کئے تو (بعد حج کے) اس طرح بے گناہ لوٹے گا جیسے اس دن بے گناہ تھا جس دن اس کی ماں نے اُسے جنا تھا"۔ (بخاری:1819)

ایک حدیث میں ہے کہ حج وعمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کا وفد (یعنی اس کے مہمانوں کی جماعت ہیں) اگر وہ اس کو پکاریں تو وہ جواب دے اور اگر مغفرت طلب کریں تو مغفرت کردے"۔ (ابن ماجہ:2892)

وفد ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی بڑی شخصیت کی بارگاہ میں نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہو، حجاج اور عمرہ کرنے والوں کو **وفدُ اللہ** ان کی عزت افزائی اور فضل وشرف میں اضافے کے لئے کہا گیا ہے جو بہ جائے خود ایک بڑی عزت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" جب تم کسی حاجی سے ملاقات کرو تو اس کو سلام کرو، اس سے مصافحہ کرو، اور اس سے کہو کہ وہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو، اس لئے کہ وہ مغفور یعنی بخشا ہوا ہے"۔ (مسند احمد: ۲/۶۹)

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص حج کے لئے یا عمرے کے لئے یا جہاد کے لئے اپنے گھر سے نکلا اور راستے ہی میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے حج کا عمرے کا اسی طرح جہاد کا اجر لکھ دیتے ہیں" (شعب الایمان:4100)

یعنی اگرچہ وہ یہ اعمال نہیں کر سکا لیکن قیامت کے دن کرنے والوں ہی میں شمار ہوگا۔

یہ تو خود حج کرنے کے فضائل ہیں اگر آدمی کسی عاجز ولاچار زندہ شخص یا کسی مرحوم کی جانب سے حج وعمرہ کرنا چاہے تو اس کا بھی بہت اجر ہے، اسلام میں اس کی اجازت بلکہ ترغیب دی گئی ہے۔

ایک خاتون نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی مگر اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا میں ان کی

جانب سے (اس نذر کو پورا کرتے ہوئے) حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’تمہاری بہن پر کسی کا قرض ہوتا اور تم ادا کرتیں تو ادا نہ ہو جاتا؟ (یقیناً ادا ہو جاتا) تو پھر اللہ کا فرض بھی ادا کر دو، اللہ تعالیٰ وفاداری کا زیادہ حق دار ہے‘‘۔(بخاری:1852)

معلوم ہوا کہ دوسروں کی جانب سے حج وعمرہ کیا جا سکتا ہے، خاص طور سے جب کہ ان کی خواہش یا ارادہ یا نذر رہو۔ البتہ مسئلہ یہ ہے کہ حجِ فرض اگر دوسرے کی طرف سے کیا جا رہا ہو تو اس شخص کا حج کرنے سے عاجز ہونا اور اپنی طرف سے بھیجنا یا اس کی وصیت کرنا اس کے ذمے سے فرض ساقط ہونے کے لئے ضروری ہے، یوں نفل طور پر حج وعمرہ زندہ مردہ کسی بھی مسلمان کی طرف سے کبھی بھی کیا جا سکتا ہے، انشاء اللہ اسے اس کا اجر ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! میرے والد بہت بوڑھے ہیں، حج وعمرہ ادا کرنے سے قاصر ہیں بلکہ نہ سواری پر بیٹھ سکتے ہیں نہ سفر کی مشقت اُٹھا سکتے ہیں، (تو مجھے کیا کرنا چاہیئے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تم اپنے والد کی طرف سے حج وعمرہ ادا کردو‘‘ (ترمذی:930)۔

بخاری کی حدیث نمبر: 1513 میں بھی اسی سے ملتا جلتا مضمون موجود ہے۔ اسی سے علماء نے فرمایا ہے کہ حج میں جب عاجز زندے کی طرف سے نیابت صحیح ہے تو مردے کی جانب سے بہ درجۂ اولیٰ صحیح ہوگی۔

عورتوں اور ضعیفوں کے حق میں تو حج عمرہ اور بھی فضیلت کا عمل ہے بل کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قائم مقام ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’بوڑھوں، ضعیفوں اور عورتوں کا جہاد حج کرنا ہے‘‘۔(نسائی:2626)

حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا ’’تم عورتوں کا جہاد حج ہے‘‘۔(بخاری:2875)

حضرت عائشہؓ نے ہی ایک دفعہ پوچھا: یارسول اللہ! کیا عورتوں پر بھی جہاد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ان پر بھی جہاد ہے مگر ایسا جہاد جس میں قتال نہیں ہے، (یعنی)

حج اور عمرہ‘‘۔(ابن ماجہ:2901)

اسی طرح حج نابالغ بچے بھی کر سکتے ہیں، اگر اُن کے ولی اُنہیں حج کو لے جائیں تو انہیں اس کا اجر ملتا ہے، ایک مرتبہ سفر کے دوران ایک خاتون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے بچّے کو دکھا کر پوچھا: کیا اس کا بھی حج ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اور تمہیں اس کا اجر ملے گا۔

(بخاری:3006)

حج کے تو ایام مقرر ہیں، قرآن کریم میں اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اور فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ کہا گیا ہے، لیکن عمرہ سال بھر میں کبھی بھی کیا جاسکتا ہے، البتہ رمضان المبارک میں کیا جانے والا عمرہ بہت بابرکت اور فضیلت والا ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خاتون سے دریافت فرمایا تھا کہ تم ہمارے ساتھ سفر حج میں کیوں نہیں چل رہی ہو؟ انہوں نے استطاعت نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے فرمایا ’’ایسا ہے تو رمضان میں عمرہ کر لینا، کیوں کہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کرنے کے برابر ہے‘‘۔(مسلم:1256)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ان کے شوہر اپنے بیٹے کو لے کر حج کو جارہے ہیں اور مجھے چھوڑ دیا، ساتھ نہیں لیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اُم سلیم! رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے‘‘۔

(الترغیب والترہیب:1651)

اور بھی متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فضیلت بیان فرمائی ہے، بخاری میں بھی اختصار کے ساتھ یہ ارشاد گرامی موجود ہے ’’رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے‘‘(بخاری:1782)

خلاصہ یہ ہے کہ حج و عمرہ دونوں اسلام میں نہایت پسندیدہ عمل ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو اس لائق بنائے کہ وہ اس فریضے کو ادا کرنے کی سعادت حاصل کرے اس کو چاہیئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے بہ صد شوق و ذوق اور بہ ہزار عجز و نیاز مکۃ المکرمۃ پہنچ کر اس کی تکمیل کرے اور اپنی قسمت پر فخر و ناز کرے، اور فریضے کی ادائیگی کے بعد بھی جب جب اللہ تعالیٰ کسی حق تلفی

کے بغیر اسباب بنائے اور سہولت دے ضرور اس شرف کو حاصل کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

(ج)

حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہ کرنے کے نقصانات

گذشتہ تمام احادیث سے حج وعمرہ کی فضیلت، اہمیت اور فوائد کا خوب اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا، معلوم ہونا چاہیئے کہ جیسے حج کرنا نہایت سعادت مندی اور شرف و بزرگی کی بات ہے اسی طرح حج فرض ہونے کے باوجود بنا کسی عذرِ شرعی کے حج وعمرہ کی سعادت سے محروم رہنا بھی بہت بدنصیبی اور محرومی کی بات ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حج کو فرض کرنے کے بعد بڑے ہی جاہ وجلال سے ___ جس کا اس کو پورا حق ہے ___ منکرینِ حج سے فرمادیا ہے:

وَمَنۡ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الۡعَالَمِينَ (سورۃ آل عمران: ۹۷)

اور جو کوئی (اس فریضے سے) انکار کرے تو (وہ سن لے کہ) اللہ تعالیٰ کُل مخلوقات سے بے نیاز ہے۔

یعنی یہ حکم اپنی شان وشوکت بڑھانے کے لئے نہیں ہے وہ اس کا ذرا بھی محتاج نہیں ہے، یہ حکم صرف بندوں کی عزت افزائی اور بخشش ومغفرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے دیا گیا ہے، اس کے باوجود اگر کسی کو قدر نہیں یا ادائیگی کی فکر و پروا نہیں ہے تو اس کی بلا سے نہ ہو، نقصان تو اسی کا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آیت کا اتنا سا ٹکڑا ہی حج کے عظیم فریضے سے لاپروائی برتنے والے مال داروں کی عبرت کے لئے بہت کافی تھا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بڑی صراحت سے امت کو اس عظیم نقصان وخسران سے چوکنا فرمادیا ہے:

ارشادِ نبوی ہے کہ ''جس شخص کا حج کرنے کا ارادہ ہو (یعنی اس پر حج فرض ہو جائے) تو اس کو چاہیئے کہ ادائیگی میں عُجلت کرے''۔(ابوداؤد:1732)اس لئے کہ زندگی موت کا کوئی بھروسہ نہیں، خدانخواستہ اسی ٹال مٹول میں موت آ گئی تو بہت بُرا ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے کہ (جس پر حج فرض ہو اور پھر بھی) حج ادا نہ کرے تو وہ اسلام میں نہیں ہے''۔(ابوداؤد:1729) حدیث کے اور بھی مفہوم ہیں، یہ مفہوم بھی شارحین حدیث نے بیان کیا ہے کہ قصداً حج سے محروم رہنے والے کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں یا اتنے حصہ ٔ اسلام سے وہ محروم ہے، بہرحال اس حدیث میں ایسے لوگوں کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے جو حجِ فرض کو ادا کرے بغیر مرجاتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص بیت اللہ تک پہونچنے کی استطاعت رکھتا ہو پھر بھی فریضۂ حج ادا نہ کرے تو اس کی مرضی خواہ وہ یہودی بن کر مرے یا عیسائی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وللہ علی الناس حج البیت.......''(ترمذی:812)۔

جب اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص سے منھ پھیر لیا ہے تو اس کا انجام جتنی بُری موت کے شکل میں ظاہر ہو کم ہے۔

ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ ''جو کوئی بندہ کسی دنیوی غرض کی خاطر حجِ فرض کو چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس حاجت کے پورا ہونے سے قبل ہی اس کے مال کو ضائع فرما دے گا''۔ (الترغیب والترہیب:1633)

حاصل یہ ہے کہ حج بہ ذاتِ خود ایک بڑی عبادت اور عظیم بزرگی ہے، مزید برآں یہ کہ اس کے دنیوی اور اُخروی فوائد بھی بے شمار ہیں، اب اس کے باوجود بھی کوئی آدمی محض لاپروائی یا بخل و کنجوسی کی وجہ سے اپنے کو اس عظیم سعادت سے محروم کر لیتا ہے تو اس کی محرومی میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے؟ اس لئے اہل استطاعت کو چاہیئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس فریضے سے سبک دوش ہوں اور دنیوی و اُخروی بے پناہ فضائل کو حاصل کر لیں۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین

(د)

فضائل مدینہ منورہ[1]

جیسے مکہ مکرمہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلی گاہ اوراس کے مبارک گھر کی گود ہے اسی طرح مدینہ منورہ بھی مکہ مکرمہ کے بعدروئے زمین کی سب سے مشرف سرزمین اور پاکیزہ شہر ہے، بلکہ مدینے کی زمین کا وہ حصہ جس نے محبوبِ خدااورفخر ارض وسما صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد خاکی کواپنی جلو میں سنبھالے ہوئے ہے وہ حصہ بالاتفاق عرش معلّی سے بھی افضل ہے۔اس لئے کون مسلمان ہوگا جسے مکہ مکرمہ تک پہونچنے کی توفیق ہواوروہ دیارِحبیب پہونچ کرمحبوب کے درِدولت پر حاضری کا شوق نہ رکھتا ہو؟ تاریخ عہدِرسالت سے لے کرآج تک مدینہ منورہ حاضر ہونے والے عشاقِ رسول کی والہانہ وعاشقانہ داستانوں سے بھری پڑی ہے،ان کی ہم ایک جھلک بھی یہاں نہیں دکھا سکتے،اس لئے مختصر فضائل کے بیان پراکتفا کرتے ہیں۔

سب سے بڑی فضیلت تو یہی ہے کہ اس شہر کا نام اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''مدینے کا نام اللہ تعالیٰ نے طابہ رکھا ہے''۔(مسلم:1385)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ''جو کوئی مومن مدینہ منورہ میں اس کی موسمی سختیوں پرصبر کرتے ہوئے قیام پذیر رہا تو میں قیامت میں اس کا سفارشی بنوں گا۔(مسلم:1378)

ایک حدیث میں ہے کہ''ایک وقت آئے گا کہ بعض لوگ خوش حالی کی تلاش میں مدینہ منورہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جائیں گے اور وہاں ان کو خوش حالی مل جائے گی تو واپس آکر اپنے لوگوں کو بھی بُلا لے جائیں گے،لیکن اگر وہ سمجھ سکتے تو مدینہ منورہ (کا قیام ہی باوجود تنگیوں کے) ان کے لئے بہتر تھا''۔(مسند احمد:8458)

ایک حدیث میں ہے کہ''تم میں سے جس سے ہو سکے کہ مدینہ میں مرے تو اس کو چاہیئے

---

[1] محدثین نے عام طور سے کتاب المناسک کا اختتام اسی عنوان پر کیا ہے۔

کہ مدینہ ہی میں مرے، اس لئے کہ مدینہ میں مرنے والوں کی میں سفارش کروں گا‘‘۔

(ترمذی:3917)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ’’اے اللہ! مدینہ کو ہمارے دلوں میں محبوب بنادیجئے اور مدینہ کی پیداوار میں برکت عطا فرمائیے، اور یہاں کی موسمی شدت کو جحفہ منتقل کردیجئے‘‘۔(مسلم:1376) جحفہ اس وقت مدینے کے باہر ایک صحرائی علاقہ تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے مدینے کی کوئی چیز کوئی گھاٹی، کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی دو مقررہ فرشتے نگہداشت نہ کررہے ہوں‘‘۔(مسلم:1374)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’مدینہ اسلام کا گنبد، ایمان کا گھر، ہجرت کی زمین، اور شریعت کا ٹھکانہ ہے‘‘۔(الترغیب والترہیب:1774)

ان احادیث کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن سے مدینہ منورہ کا مبارک اور بہت محبوب شہر ہونا معلوم ہوتا ہے، نیز یہ کہ وہ فتنوں سے محفوظ شہر ہے اور یہ کہ اس میں دجّال اور طاعون کا داخلہ نہیں ہوسکتا، اور اس کا بھی حرم ہے جس کے حدود نبی کریم ﷺ نے طے فرما دیئے ہیں وغیرہ۔

جہاں تک مسجد نبوی کے فضائل کا تعلق ہے تو اس کی بھی بہت فضیلتیں آئی ہیں:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’تین مسجدیں ایسی ہیں کہ ان کی زیارت کے لئے (یعنی ان میں نمازوں کا اضافی ثواب حاصل کرنے کے لئے) سفر کرکے جاسکتے ہیں، مسجد حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری یہ مسجد‘‘ (بخاری:1189) یعنی مسجد نبوی۔

ایک حدیث میں ہے کہ میری مسجد میں ایک نماز ادا کرنا مسجد حرام کو چھوڑ کر دیگر مساجد کے مقابلے میں ایک ہزار نماز پڑھنے کے برابر ہے‘‘۔(بخاری:1190)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’میرے منبر اور مکان کے درمیان (جو جگہ ہے وہ) جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے‘‘۔(بخاری:1195)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کیں اس کے لئے دو پروانے ہیں، ایک عذاب سے نجات، دوسرے نفاق سے برأت''۔

(مسند احمد:12584)

مدینہ منورہ میں ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد قبا ہے اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد قبا میں ایک نماز پڑھنا عمرہ کرنے کے برابر ہے''۔

(ترمذی:324)

اب رہ گئی بات قبر اطہر کی زیارت کی تو اللہُ اکبر! کیا کہنے اس سعادتِ عظمٰی کے یہ تو عشاقِ نبی کے لئے کبریتِ احمر سے زیادہ قیمتی دولت اور ہر لذت سے بڑی لذت ہے، اس لئے کہ محبوب کی زیارت سے بڑی کسی کی کیا آرزو ہوسکتی ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کرم ہے کہ انہوں نے اپنی زیارت کے اس مبارک عمل کو ـــ جس کی کوئی فضیلت نہ بتائی جاتی تو بھی اُمت کے لئے واجبُ العمل اور آوازِ فطرت ہونی چاہیئے تھی ـــ باعثِ سعادت و برکت قرار دیا، بلکہ اگر کسی بدنصیب نے اس کی ضرورت نہ سمجھی تو اسے بے وفا بتلایا، ہمارے نزدیک تو وہ شخص منافق ہی ہونا چاہیئے جو بارگاہِ خداوندی تک پہنچنے کے بعد محبوبِ خدا کے دیار میں حاضری کی آرزو اور شوق اپنے دل میں نہ پاتا ہو، مگر افسوس کہ اس دور میں بعض محروم لوگ توحید میں پختگی کے نام پر عشق و محبت کی باتوں کے منکر ہو بیٹھے ہیں، تُف ہے اُن کے خیالوں اور حبِّ رسول سے خالی سینوں پر، اور آفرین ہے محدثین وفقہاء اور علماء و اولیاء کے مزاجوں پر جنہوں نے نہ صرف یہ کہ محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے تقاضوں پر صحابہ کرامؓ کی طرح والہانہ عمل کیا بلکہ اس فضیلت سے بھی بعد والوں کو آگاہ رکھا، ایک دو حدیثیں مختصراً ملاحظہ کر لیجئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اخلاص وللٰہیت کے ساتھ میری زیارت کی کل قیامت میں وہ میرے پڑوس میں ہوگا''۔(شعب الایمان:3861)

ایک حدیث میں ہے کہ جس نے حج کیا اور میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو

اس نے مجھ سے زندگی ہی میں ملاقات کی''۔(شعب الایمان:3857)

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا ہے کہ''اس بات کے ثبوت میں ان کے علاوہ بہت احادیث ہیں اور زیارتِ نبوی کے فضائل معروف ہیں۔(مرقاۃ المفاتیح:٥/٦٣٩)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت لازم ہوگئی۔''(شعب الایمان:3862)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ:

جب تک ایک امتی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت اللہ تعالیٰ کے سوا دنیا کی ہر چیز سے (حتیٰ کہ اپنے ماں باپ، اہل وعیال اور خود اپنی ذات سے بھی) زیادہ نہ ہو اس وقت تک اس کو ایمان کی حقیقت ولذت حاصل نہیں ہوسکتی اور روضۂ اقدس نبوی کی زیارت بلاشبہ اس محبت کے لازمی تقاضوں میں سے ہے، اور گویا اس کی ایک عملی صورت ہے۔عربی شاعر نے کہا ہے ؎

امرّ علی الدیار دیار لیلیٰ　　　اقبل ذاالجدار و ذاالجدار

و ماحب الدیار شغفن قلبی　　　و لکن حب من سکن الدیار

(یعنی میں جب اپنی محبوبہ لیلیٰ کی بستی سے گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو اور دراصل اس بستی کے گھروں کی محبت نے میرے دل کو دیوانہ نہیں بنایا بلکہ میں تو اس بستی میں بسنے والے محبوب پر فدا ہوں۔)

علاوہ ازیں زیارت کے وقت زائر کے قلبِ مومن کی جو کیفیت ہوتی ہے اور جوارِ نبوی کی برکت سے ایمان وعہد کی تجدید، گناہوں پر ندامت وشرمساری، انابت الی اللہ اور توبہ و استغفار کی جو لہریں اُس وقت اُس کے قلب میں اُٹھتی ہیں اور محبت نبوی کے جو جذبات موجزن ہوتے ہیں اور محبت وندامت کے ملے جلے جذبات آنکھوں سے جو آنسو گراتے ہیں، ان میں سے ہر چیز ایسی ہے جو شفاعتِ نبوی بلکہ مغفرتِ خداوندی کو بھی واجب کر دیتی ہے، اس لئے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ روضۂ اقدس نبوی کے ہر صاحبِ ایمان زائر کو

انشاء اللہ ضرور شفاعتِ نبوی نصیب ہوگی۔ ہاں اگر بدنصیبی سے کوئی ''زائر'' ایسا ہے جس کے قلب کو ان کیفیات وجذبات اور ان واردات میں سے کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کا قلب دولتِ ایمان سے خالی ہے پھر اس کی زیارت حقیقی زیارت نہیں صرف صورتِ زیارت ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاں کسی عمل کی بھی صرف صورت معتبر نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے جن منافع اور برکات ومصالح کا اوپر ذکر کیا گیا اگر ان کو پیشِ نظر رکھ کے اُن احادیث پر غور کیا جائے جو اس زیارت کی ترغیب میں مروی ہیں تو خواہ سند کے لحاظ سے ان پر کلام کیا جا سکے، لیکن معنوی لحاظ سے وہ دین کے پورے فکری اور عملی نظام کے ساتھ بالکل مرتبط اور ہم آہنگ نظر آئیں گی اور ذہن سلیم اس پر مطمئن ہو جائے گا کہ قبر مبارک کی یہ زیارت صاحب قبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ایمانی تعلق اور محبت وتوقیر اور دینی ترقی کا خاص وسیلہ ہے، یقین ہے کہ ہر خوش نصیب صاحب ایمان بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے زیارت کی سعادت سے بہرور فرمایا ہے اس کی شہادت دے سکے گا۔

مولانا نعمانیؒ کے اس مختصر مگر جامع تبصرہ کے بعد اس سلسلے میں مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے، اسی پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سچی محبت اور والہانہ تعلق نصیب فرمائے آمین۔

۵

تلاوۃالقرآن

قرآن کریم کی تلاوت

(الف)

قرآن کریم کا مقام

تلاوت لغت کے اعتبار سے ایک کے پیچھے ایک چلنے کو کہتے ہیں، پڑھنے کو بھی تلاوت کہتے ہیں، اور اصطلاحی معنیٰ کے اعتبا سے اس کے دو مفہوم ہیں، ۱قرآن مجید تجوید وقواعد کی رعایت کے ساتھ اس طرح پڑھنا کہ سننے والا اس کا مفہوم بھی سمجھ سکے، ۲مقدار مقرر کر کے اس مقدار کی پابندی کرنے کو بھی اہل فن ''تلاوت'' کہتے ہیں: قرأت اور تلاوت میں فرق یہ ہے کہ قراءت ہر پڑھنے کو کہتے ہیں اور تلاوت کا اطلاق صرف قرآن مجید کے پڑھنے پر ہوتا ہے۔(کشاف اصطلاحات الفنون: ۱/۲۲۴)

اور لفظ قرآن کے معنیٰ ہیں جمع کرنے والا، چوں کہ اس میں تمام احکام جمع ہیں اس لئے اس کو قرآن کہا جاتا ہے، یا بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے اس لئے قرآن کہتے ہیں، بہ ہر حال شریعت میں اس کی تعریف یہ ہے کہ ''قرآن وہ کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، جو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک بہ تواتر بلا انقطاع منتقل ہوتی ہوئی آئی ہے''۔(التعریفات: ۱۶۹)

تلاوت کے اہل فن کے ہاں متعدد درجات ہیں، ان میں سے تین بہت معروف ہیں،

١ـ الترتیل ، یعنی ٹھیر ٹھیر کر اطمینان کے ساتھ پڑھنا جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَرَتَّلْنَاہُ تَرْتِیلاً اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیلًا ، چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کی تلاوت اس طرح فرماتے تھے کہ سننے والے کو ایک ایک حرف سمجھ میں آجاتا تھا، بلکہ کوئی حروف گِننا چاہے تو گِن سکتا تھا، اور مفہوم پر توجہ دیتا تو بات پوری طرح سمجھ لیتا تھا۔

٢ـ الحدر ، حدر کے معنیٰ اوپر سے نیچے آنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تیز رفتاری سے تلاوت کرنا اس لئے کہ اوپر سے نیچے کی طرف جانے یا لڑھکنے میں تیز رفتاری فطرتاً لازم ہوتی ہے، اسی معنیٰ میں تیز پڑھنے کو الحدر کہتے ہیں، تاہم یہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ تلاوت میں وہی تیز رفتاری جائز ہے جس میں حق تلفی اور اصولِ تجوید کی خلاف ورزی نہ ہو، چناں چہ اہل فن کہتے ہیں کہ ''الحدر'' ایسی طرح تلاوت کرنے کو کہتے ہیں جس میں اظہار وادغام، مدوقصر، اور عربوں کے فصیح لب ولہجے کی رعایت کے ساتھ تیز رفتاری ہو۔

٣ـ التدویر ، یہ ترتیل اور حدر کے درمیان کی رفتار کا نام ہے، یعنی بہت اطمینان بھی نہیں اور بہت تیزی سے بھی نہیں بلکہ توسط واعتدال کی رفتار سے پڑھنا۔ مختصر یہ کہ تینوں طرح پڑھنا تلاوت کہلاتا ہے، البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم ترتیل کے ساتھ تھوڑا پڑھنا افضل ہے یا رفتار کے ساتھ زیادہ پڑھنا؟ دونوں طرح کا قول وعمل سلف سے ثابت ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سلف صالحین کا مقدارِ تلاوت کے سلسلے میں الگ الگ مزاج رہا ہے، بعض حضرات دو مہینے میں ایک ختم کرتے تھے (یعنی روزانہ آدھا پارہ تلاوت کرتے تھے) اور بعض مہینے میں ایک ختم (یعنی روزانہ ایک پارہ تلاوت) کرتے تھے، یہی مقدار اکثر سلف کی تھی، پھر یہ مقدار بڑھتے بڑھتے شب وروز میں آٹھ ختم تک بھی پہنچ جاتی ہے (یعنی بعض بندگانِ خدا کا دن رات یہی مشغلہ تھا کہ فرائض کے علاوہ تلاوتِ قرآن ہی کرتے تھے، ممکن ہے وہ حضرات اور ذمہ داریوں سے فارغ اور بالکل یکسو ہوں گے، رہ گئی یہ بات کہ کیا یہ ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اگر پڑھتے پڑھتے اس قدر مہارت ہوگئی ہو کہ مسلسل پڑھ سکتا

ہوتو اس قدر پڑھنا ممکن ہے، بالخصوص جن بندگانِ خدا کے اوقات میں خاص برکت بھی ہوتی ہے ان کے لئے تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے (اور یہ آخری مقدار والے غالباً ایسے ہی اصحابِ حال ہوں گے۔)

آگے امام صاحب فرماتے ہیں کہ مقدارِ تلاوت کے سلسلے میں پسندیدہ بات یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے مشاغل اور ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنی مقدار مقرر کرلیں کہ تعب اور حق تلفی کا سبب نہ ہو، اسی طرح جس کا جی چاہتا ہے کہ علومِ قرآن میں خوب تدبُّر کرے، اس کی حکمتوں اور باریکیوں تک پہنچے اور اس سے احکام ومسائل کا استنباط کرے تو اس کو چاہیئے کہ اطمینان سے ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھے تاکہ مقصد حاصل ہو اگرچہ مقدار کم ہو، اسی طرح جس آدمی پر ذمّے داریوں کا بوجھ ہو اور تعلیم وتبلیغ یا دیگر فرائض میں مشغول ہو تو وہ بھی مقدار کو مختصر کرسکتا ہے، اور جس شخص کو موقع ہو اور فرصت رکھتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے، بس اس کا لحاظ رکھے کہ نشاط کے ساتھ پڑھتا رہے، بے زارگی اور زبردستی کی تلاوت نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ بعض بزرگوں نے ایک دن رات میں ختمِ قرآن کو مکروہ سمجھا ہے اس حدیث شریف کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تین دن سے کم میں ختمِ قرآن کرنے والا فہمِ قرآن کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ (الاذکار: ۱۴۴)

امام سیوطیؒ تلاوتِ قرآن کے آداب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تلاوت کرنے والے کو چاہیئے کہ ۱ باوضو تلاوت کرے، جس کو نہانے کی حاجت نہیں وہ قرآن کریم چھوئے بغیر بے وضو بھی پڑھ سکتا ہے مگر تلاوتِ قرآن چوں کہ سب سے افضل ذکر ہے اور اللہ کا ذکر طہارت کے ساتھ ہی کرنا چاہیئے، تو قرآن کریم بہ درجۂ اولیٰ باوضو کرنا چاہیئے۔ ۲ یہ بھی مسنون ہے کہ جس جگہ تلاوت کررہا ہے وہ جگہ بھی صاف ستھری اور پاکیزہ ہو، اور سب سے پاکیزہ جگہ مسجد ہے۔ ۳ یہ بھی مسنون ہے کہ عظمتِ قرآن کو ملحوظ رکھتے ہوئے تلاوت سے قبل مسواک کرلے، اس لئے کہ مسواک منھ کی طہارت کا سبب ہے۔ ۴ بہتر ہے کہ تلاوت کرنے والا قبلہ رو ہوکر بیٹھے، خشوع، سکون ووقار کے ساتھ بیٹھے، اِدھر اُدھر متوجہ نہ رہے۔

۵۔ تلاوت سے قبل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہہ کر شیطانِ مردود کی مداخلت سے اپنے کو محفوظ کر لے۔ ۶۔ تلاوت تدبُّر وتفکُّر سے کرے کیوں کہ اصل مقصود وہی ہے اور اسی سے قلوب کو روشنی وراحت نصیب ہوتی ہے، تاہم جو لوگ عربی زبان سے واقف نہیں ہیں وہ حق تعالیٰ کے کلام ہونے کے استحضار کے ذریعے اپنے اندر خشوع اور احترام پیدا کریں، نیز تلاوت کے علاوہ کسی مستند عالمِ دین کا ترجمۂ قرآن بھی دیکھ لیا کریں، اس سے بھی بہت نفع ہوتا ہے۔ ۷۔ تلاوتِ قرآن سے ایسا تأثر بھی لیتے رہنا چاہیئے جس سے رونا آئے اور دل نرم ہو۔ (الاتقان: ۱/۱۸)

امام نووی ؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت کے لئے سب سے افضل وقت تو نمازوں کے اندر ہے، نمازوں کے بعد بہتر ہے کہ رات میں تلاوت کی جائے، رات میں بھی پچھلے پہر یعنی اخیر شب میں کرنا چاہیئے، مغرب عشا کے درمیان بھی تلاوت پسندیدہ ہے، جہاں تک دن میں تلاوت کا معاملہ ہے تو صبح کی نماز کے بعد کا وقت بہتر ہے، لیکن کوئی بھی وقت ایسا نہیں ہے جس میں تلاوت ممنوع ہو، یعنی جو وقت نفل نمازوں کے لئے ممنوع ہے اس میں بھی تلاوت مشروع ہے؛ رمضان المبارک میں بہ کثرت تلاوت کرنا سنت سے ثابت ہے، بالخصوص عشرۂ اخیرہ میں اور اس میں بھی طاق راتوں میں تلاوت کرنا اور زیادہ بابرکت ہے، رمضان کے بعد ذی الحجہ کے عشرۂ اولیٰ میں اور عرفے کے دن جس قدر ہو سکے قرآن کریم کی تلاوت کرنا چاہیئے۔ (التبیان: ۱۴)

حضرت شاہ ولی اللہ ؒ بعض نیکیوں کے اسرار بیان کرتے ہوئے تلاوتِ قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت اور مواعظ کا سننا (بھی ایک نیکی ہے) جو کوئی شخص اس کا اہتمام کرتا ہے اور اس کی عادت ڈال لیتا ہے تو وہ خوف ورجا کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کے صحرا میں کھو جاتا اور اس کی نعمتوں کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے، پھر اس عبدیت اور کسرِ نفسی کی برکت سے بڑے بڑے فائدے حاصل کر لیتا ہے، اور نفس کو اس سے بھی آگے کے مقامات کے لائق بنا لیتا ہے، اسی وجہ سے تلاوتِ قرآن اور اس

میں تدبُّر انجامِ کار سب سے زیادہ نافع چیز ہے، نیز قرآن کریم میں نفس کو اس کے رذائل سے پاک کرنے میں بہت تاثیر اور دخل ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "ہر چیز کی صفائی کا ذریعہ ہوتا ہے اور قلوب کی صفائی کا ذریعہ قرآن کریم کی تلاوت ہے"۔

(حجۃ اللہ البالغہ: ۱/ ۲۶۴)

(ب)

تلاوت قرآن کے فضائل وفوائد

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد گرامی ہے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (سورۃ البقرۃ: ۱۲۱)	بے شک جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں یہی لوگ (حقیقت میں) اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کا انکار کریں وہی لوگ ہیں جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

آیت میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کتاب کی نہ صرف تلاوت کرتے ہیں بلکہ حق تلاوت بھی ادا کرتے ہیں یعنی اس کے موافق عمل بھی کرتے ہیں، فرمایا کہ کتاب پر ایمان لانے کی حقیقت یہی ہے، اس کے برخلاف جو لوگ کتاب کا انکار اور ناقدری کرتے ہیں یعنی نہ ہی اس کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے عمل سے ایمان کا ثبوت دیتے ہیں ایسے لوگ انجام کار بہت نقصان میں ہیں اس لئے کہ کتاب اللہ کی ناقدری انہیں جہنم میں لے جائے گی۔

مذکورہ بالا آیت میں سچے اہل کتاب کی تعریف اور جھوٹوں اور بدعملوں کی مذمت بیان فرمائی گئی ہے، ایک دوسری آیت میں بھی اہل کتاب کے ان لوگوں کی تعریف کی جارہی ہے جنہوں نے کتابِ الٰہی کی ناقدری نہیں کی تھی۔

لَيْسُوْا سَوَآءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ (سورۃ ال عمران: ۱۱۳)

سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہوتے ان میں ایک جماعت وہ بھی ہے جو حق پر قائم ہے اور رات بھر اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کرتی رہتی ہے اور وہ نمازی ہے۔۔۔

اہل کتاب میں جو اچھے اور سچے لوگ تھے اُن کی تعریف کرتے ہوئے سب سے پہلے تلاوتِ کتاب کا ذکر فرمایا یعنی پوری پوری رات نوافل پڑھتے اور ان میں طویل قراءت کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (سورۃ الانفال: ۲)

حقیقت میں مومن وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی جاتی ہے تو ان کے دل کانپ اُٹھتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (سورۃ الکہف: ۲۷)

آپ کے رب کی جو کتاب آپ پر وحی کی جاتی ہے آپ اس کی تلاوت کیجئے، کوئی اس کے احکام کو بدل نہیں سکتا۔

ایک جگہ اور ارشاد فرمایا:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا

اور (اے پیغمبر!) تم جس حالت میں بھی ہوتے ہو اور قرآن کا جو حصہ بھی تلاوت

كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ

کرتے ہو، اور (اے لوگو!) تم جو کام بھی کرتے ہو تو جس وقت تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو، ہم تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔

تلاوتِ قرآن مجید کے احترام کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (سورۃ الاعراف:۲۰۶)

اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو دھیان دے کر اس کو سنو اور خاموش رہو، (اس کی برکت سے) تم پر رحم کیا جائے گا۔

سورۃ الاحزاب میں ازواجِ مطہرات کو بہت سی اہم ہدایات دی ہیں، انہی کے ضمن میں تلاوت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا (سورۃ الاحزاب:۳۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔ یقین جانو اللہ بہت باریک بیں اور ہر بات سے باخبر ہے۔

سورۂ فاطر میں مومنین کے چند خاص اعمال کا ذکر کر کے ان کی محبت کو بے خسارے کی تجارت قرار دیا، ان اعمال میں سب سے پہلے قرآن کریم کی تلاوت کا ذکر ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ (سورۃ الفاطر:۳۰)

جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اور جنہوں نے نماز کی پابندی کر رکھی ہے، اور ہم نے اُنہیں جو رزق دیا ہے، اس میں سے وہ (نیک کاموں میں) خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے اُمیدوار ہیں جو کبھی نقصان نہیں اُٹھائے گی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے

پورے اجر اُن کو دے دے اور اپنے
فضل سے اور زیادہ بھی دے۔ یقیناً وہ
بہت بخشنے والا، بڑا قدر دان ہے۔

تہجد میں تلاوت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ (سورۃ المزمل:۲۰) لہٰذا تم اُس (قرآن) میں سے اتنا ہی پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو۔

جس طرح قرآن کریم میں تلاوت کے فضائل اور تلاوت کی ترغیب وحکم مختلف مقامات پر دیا گیا ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی تلاوتِ قرآن کے سلسلے میں بہت توجہ دلائی ہے بار بار اس کے فضائل سنائے ہیں، اس کی حق تلفی کے مضرات سے آگاہ کیا ہے، جس کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعد آج تک بھی آپ کے ارشادات سے واقف لوگ قرآن کریم سے خاص تعلق ومحبت اور اس کی تلاوت کا اہتمام رکھتے ہیں، اگرچہ آج کل یہ اہتمام اور ذوقِ تلاوت دن بہ دن کم ہوتا نظر آ رہا ہے تاہم سالکین راہِ خدا کو تو اس سے دور نہیں رہنا چاہیئے سالکین میں ذوق پیدا کرنے کے لئے ذیل میں اس سلسلے کی چند احادیث پیش کی جارہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''قرآن پڑھا کرو اس لئے کہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے سفارشی بن کر آئے گا، سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھا کرو یہ دونوں قیامت میں اپنے پڑھنے والے پر دوسایوں یا دو سائبانوں یا پرندوں کی دو قطاروں کی شکل میں آئیں گی اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے حجت کریں گی، سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتے رہو، اس لئے کہ اس کا پڑھنا برکت اور چھوڑنا حسرت ہے۔'' (مسلم:804)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جب تک جی لگا رہے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہا کرو، ہاں جب طبیعت گرانی محسوس کرنے لگے تب رُک جاؤ'' (مسلم:796)

مطلب یہ ہے کہ بہ کثرت تلاوت کرتے رہو، البتہ جب طبیعت تھک جائے اور جی دوسری طرف متوجہ ہونے لگے تو اس وقت زبردستی پڑھتے رہنا مناسب نہیں ہے، کیوں کہ اس

طرح کرنے سے بے زارگی محسوس ہوتی ہے جو اچھی بات نہیں ہے، یوں بھی اسلام اپنے ماننے والوں پر طاقت سے زیادہ کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ’’حسد دو آدمیوں کے علاوہ کسی پر نہیں کیا جاسکتا‘‘ (ان میں سے ایک) وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم (پڑھنا) سکھایا ہو اور وہ دن رات (اتنی) تلاوت کرتا ہو کہ اس کے پڑوسیوں کو تمنا ہونے لگے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسا ماہر قرآن بناتا تو ہم بھی اس ماہر کی طرح خوب تلاوت کرتے۔‘‘ (بخاری:5026) علماء فرماتے ہیں کہ یہاں حسد سے مراد غبطہ اور رشک ہی ہے جیسا کہ حدیث میں دیکھنے والے کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ اسے بھی یہ آرزو ہونے لگے کہ مجھے بھی اس کی طرح خوب پڑھنے کی توفیق ملتی، اور کسی کی نعمت دیکھ کر ایسی آرزو کا پیدا ہونا وہ حسد نہیں ہے جس کی مذمت بیان ہوئی ہے، گویا لفظِ حسد کا استعمال تفہیم کے لئے ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ’’جو مومن قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہتا ہے اس کی مثال اُترجّہ نامی پھل کی سی ہے کہ اس کی خوش بو بھی عمدہ ہوتی ہے اور لذت بھی خوب ہوتی ہے، اور وہ مومن جو قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس کا مزہ تو اچھا ہوتا ہے مگر خوش بو کوئی نہیں ہوتی، اور جو منافق قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال حنظلہ کی سی ہے کہ مزہ بھی کڑوا اور بُو بھی گندی ہوتی ہے‘‘۔ (بخاری:5020) یعنی ایسے منافق کا ظاہر و باطن دونوں تباہ حال ہیں، برخلاف اس مومن کے جو قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اس کا ظاہر و باطن دونوں منور اور تجلیاتِ خداوندی سے معمور ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ’’جب بھی کسی مسجد میں چند لوگ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی کتاب ــــ قرآن کریم ــــ کی تلاوت کرتے اور سیکھتے سکھاتے ہیں تو ضرور ان پر سکینت اترتی ہے، رحمت اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے، انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس موجود فرشتوں میں (خوشی سے) ان کا ذکر فرماتا ہے‘‘۔ (مسلم: 6299)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’قیامت کے دن حافظِ قرآن آئے گا تو (قرآن) کہے گا:

اے پروردگار! اس کو مزین فرما، تو اسے تاج الکرامۃ یعنی عزت کا تاج پہنایا جائے گا قرآن عرض کرے گا: اے رب! اور اضافہ فرما، تو اسے حلۃ الکرامۃ یعنی عزت کا پورا جوڑا پہنایا جائے گا، پھر عرض کرے گا: اے رب! اس بندے سے تو راضی ہو جا، تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائیں گے اور فرمائیں گے (قرآن) پڑھتا جا تا اور بلند ہوتا جا (جیسے جیسے وہ پڑھتا جائے گا) ہر آیت کے ساتھ اس کی نیکیوں میں ایک نیکی کا اضافہ بھی کیا جاتا رہے گا''۔ (ترمذی:2915) یعنی دنیا میں تلاوت کی وجہ سے جو اجر ملا وہ اپنی جگہ آخرت کے اس پڑھنے پر بھی نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، سبحان اللہ! ۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ اس سے کہا جائے گا''قرآن کی تلاوت کرتا جا اور ہر آیت پر ایک درجہ (درجاتِ جنت میں) بڑھتا جا، تیری آخری منزل وہ ہوگی جہاں تو پڑھنا ختم کردے گا''۔ (ابوداؤد:1464) اس لئے حفاظ کرام کو چاہیے کہ قرآن مجید پڑھتے رہنے اور پختہ رکھنے کا اہتمام رکھیں، اس لئے کہ اگر یاد نہ ہوگا تو وہ جنت کے بلند درجات تک ترقی نہ کر سکے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص قرآن مجید کا (اخلاص کے ساتھ) ایک حرف تلاوت کرتا ہے تو اسے ایک نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی دس گُنا ہوتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ (اس میں) الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف''۔ (ترمذی:2910) یعنی الٓمٓ پڑھنے والے کو تیس نیکیاں ملتی ہیں، اسی طرح جتنی بھی تلاوت کریں گے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی چلی جائیں گی، واقعی بہت بڑا مقام ہے تلاوتِ قرآن کا۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے خواص ہیں'' پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ کون (خوش قسمت) لوگ ہیں، آپ نے فرمایا ''قرآن والے، یہی لوگ اللہ والے اور اس کے خواص ہیں'' (ابن ماجہ فی المقدمہ:215)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آپ سے کوئی خاص نصیحت کرنے کی درخواست کی تو آپ نے سب سے پہلے تقویٰ کی تاکید فرمائی کیوں کہ وہ ہر عمل کی شان ہے، اس کے بعد مزید نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے اوپر تلاوتِ قرآن کو لازم کرلو، اس لئے کہ

وہ دنیا میں تمہارے لئے نور ہے اور آسمان میں تمہارا ذخیرۂ اجر وثواب ہے‘‘۔(الترغیب والترہیب:2067)

ایک حدیث میں ہے کہ قرآن آدمی کا مقبول سفارشی اور معتبر مددگار ہے، جو شخص اس کو اپنے آگے رکھے گا (یعنی اقتداواتباع کرے گا) تو وہ اُسے جنت میں لے کر جائے گا جو شخص قرآن کو پیٹھ کے پیچھے ڈال دے گا (یعنی نہ پڑھے گا نہ اُس پر عمل کرے گا) تو وہ اُسے جہنم تک پہنچائے گا۔‘‘ (الترغیب والترہیب:2068)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’تم میں سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے‘‘ (بخاری:5027)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’قرآن کریم کا ماہر (یعنی بہ سہولت پڑھ سکنے والا) تو فرشتوں کے ساتھ ہے اور جو شخص قرآن اٹک اٹک کے پڑھتا ہے اور وہ اس کے لئے دشوار ہے (پھر بھی پڑھتا رہتا ہے) اس کے لئے دوہرا اجر ہے‘‘ (بخاری:4937)

یعنی اگر پڑھنا سیکھنے کی کوشش کر چکا ہے اور کسی وجہ سے روانی پیدا نہ ہوسکی ہے، ورنہ جس نے قرآن مجید پڑھنا سیکھا ہی نہیں اور اس وجہ سے پڑھ نہیں پاتا تو وہ قرآن نہ سیکھنے کا گنہ گار ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ اس کتاب (کے حقوق ادا کرنے کی برکت) سے قوموں کو سربلند فرماتا ہے اور اسی کتاب (کی حق تلفی کی نحوست) سے ذلیل وسرنگوں کرتا ہے‘‘ (مسلم:816)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’پروردگار فرماتا ہے جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کی وجہ سے مجھ سے اپنی حاجات بھی نہیں مانگ پاتا تو میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ عطا کرتا ہوں‘‘۔(ترمذی:2926)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’جو شخص قرآن مجید پڑھے (حافظ بنے یا بہ کثرت تلاوت کرے) اور اس کے احکام پر چلے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی دنیا میں جو سورج کی روشنی ہے اس سے بھی بہتر ہوگی، اگر وہ تمہارے گھر میں

ہو، پھر تمہارا کیا خیال ہے حافظ کے ثواب کے بارے میں جس نے خود اس پر عمل کیا ہے۔

(ابوداؤد:1453)

ایک حدیث میں ہے کہ ''کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اس چیز سے بڑھ کر جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے نکلی ہے کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتا'' (ترمذی:2911) یعنی تلاوتِ قرآن اور اس پر عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل ہوسکتا ہے وہ کسی اور عمل کے ذریعے نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس کی ذات سے ظاہر ہوا ہے، ظاہر ہے کہ کسی اور شئ کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جس شخص نے قرآن مجید پڑھا (اس کو حفظ کرلیا) اس نے اپنے سینے میں علومِ نبوت کو محفوظ کرلیا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کو وحی نہیں آئے گی، صاحبِ قرآن (حافظ) کو چاہیئے کہ نہ کسی جھگڑنے والے سے جھگڑے اور نہ کسی جاہل سے الجھے کیوں کہ اس کے سینے میں اللہ کا کلام محفوظ ہے''۔ (مستدرک حاکم:2028) یعنی حفاظِ قرآن کو اپنی اس عظیم سعادت اور بلند ترین مرتبے کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیئے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے سینے میں کلامُ اللہ ہے تاکہ وقار و شرافت کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہ ہو جائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص (کم از کم) دس آیتیں بھی قرآن کریم کی روزانہ تلاوت کرلے وہ غافلین میں شمار نہیں کیا جاتا''۔ اور اگر روزانہ سو آیتیں پڑھ لے تو قانتین میں شمار ہو جائے گا''۔ (مستدرک حاکم:2042)

مذکورہ بالا آیات و احادیث شریفہ سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم جو کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کا کلام ہے اس کے پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے کتنے فضائل آئے ہیں اور یہ کیسا عظیم الشان عمل ہے، لیکن کیا مسلمان آج اس کتاب کے حقوق ادا کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں؟ ہرگز نہیں! اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس مبارک عمل کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

(ج)

قرآن کریم سے لاپروائی کے نقصانات

جیسے قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر عمل انتہائی فضیلت کی بات ہے وہیں اس سے غفلت ولاپروائی بہت ہی مذموم حرکت اور نقصان پہچانے والا عمل ہے، کتاب وسنت میں قرآن کریم کی گستاخی یا حق تلفی کرنے والوں پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَن يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (سورۃ البقرۃ:۱۲۱)

جو کوئی قرآن کریم کا انکار کرے وہی نقصان اُٹھانے والا ہے۔

کفار کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سورۃ لقمان:۷)

اور جب ایسے شخص کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو وہ پورے تکبر کے ساتھ منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہیں، گویا اس کے دونوں کانوں میں بہرا پن ہے ۔لہذا اُس کو ایک دُکھ دینے والے عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

کفار ومنکرین کی تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (سورۃ ھود:۱۷)

اور ان گروہوں میں سے جو شخص اس کا انکار کرے، تو دوزخ ہی اس کی طے شدہ جگہ ہے، لہذا اس (قرآن) کے بارے میں شک میں نہ پڑو، یقین رکھو کہ یہ حق ہے جو

تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا
ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لا رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے ''جس کے سینے میں کچھ بھی قرآن محفوظ نہیں وہ سینہ ویران یا اُجڑے گھر کے مانند ہے''۔(ترمذی:2913)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے ''جس گھر میں کتاب اللہ کی کچھ بھی تلاوت نہیں کی جاتی وہ ہر خیر سے خالی اور محروم گھر ہے''۔(الترغیب والترہیب:2096)

ایک حدیث میں ہے کہ ''میرے سامنے (عالم مثال میں) میری اُمت کے گناہ پیش کئے گئے میں ان میں قرآن مجید کی سورت یا آیت یاد کر کے بُھلا دینے سے بڑا گناہ (یعنی اس کا وبال) نہیں دیکھا''۔(ابوداؤد:641)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص قرآن کریم یاد کیا پھر اس کو بھلا دیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے (کل قیامت میں) جذام کی بیماری کے ساتھ ملے گا''۔(ابوداؤد:1474)

جذام، ایک مکروہ بیماری ہے اس میں آدمی کا جسم سڑ کر پھٹنے اور گرنے لگتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ مکمل یا جس قدر بھی حفظِ قرآن کی توفیق دے تو اس کو چاہئیے کہ اس کی قدر کرتے ہوئے قرآن کریم کو محفوظ رکھے، پڑھتے رہے اور عمل کرتا رہے، لیکن اس نے اگر اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے اس سے بے التفاتی کی اور غفلت برتتا رہا یہاں تک کہ بُھلا بیٹھا تو اس ناقدری کے نتیجے میں یہ قیامت کے روز کوڑھ کی انتہائی مکروہ بیماری کے ساتھ حاضر کیا جائے گا، اللہ بچائے۔ بعض شارحین نے اس کا مفہوم یہ بیان فرمایا ہے کہ ایسا شخص قیامت میں خالی ہاتھ ہوگا یعنی کسی اجر کا مستحق نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی عظیم امانت ہے، مسلمانوں کو اس سے بالکل لاپروائی نہیں برتنی چاہیئے، خوب تلاوت کرنا چاہیئے، اس میں تدبر کرنا چاہیئے اور اس پر عمل کی سعی کرتے رہنا چاہیئے، بالخصوص حفاظ کرام کو تو اس کی ہر طرح حفاظت کا اہتمام رکھنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین

(۶)

کثرۃ الذکر

ذکر اللہ کی کثرت

(الف)

ذکر کی حقیقت اور مقام

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، اس کی تعریف بجالانا، اس کی تسبیح وتحمید کرتے رہنا مومن کے لئے سب سے عظیم اور سب سے لذیذ نعمت ہے، یہ ہر عمل سے بڑا عمل اور ہر عبادت سے بڑی عبادت ہے، بلکہ کُل عبادتیں یادالٰہی ہی کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ''وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ '' اور نماز قائم کرو میری یاد کے واسطے، اسی طرح ''وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ '' یقیناً اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی سب سے بڑا عمل ہے، اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ جب نمازِ جمعہ کے لئے اذان کہہ دی گئی تو اللہ کی یاد یعنی نماز جمعہ کی تیاری میں لگ جاؤ، حج کے سلسلے میں فرمایا: اِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ، جب مناسکِ حج سے فارغ ہوجاؤ تو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوجاؤ۔ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ، مزدلفہ میں بھی اللہ کا ذکر کرو، وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰاکُمْ ، جب اللہ نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا ہے تو تم بھی اُسے یاد رکھا کرو۔ اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ، اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا وغیرہ بے شمار آیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اور اس کے

روح کا اصل وظیفہ یادِ الٰہی اور ذکر اللہ ہی ہے، اس میں دنیا وآخرت کے بے پناہ فوائد اور بے حساب فضائل ہیں۔

ذکر کی حقیقت ہے بھول اور غفلت سے چھٹکارا، امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ ذکر سے کبھی مراد ہوتی ہے نفس کی وہ کیفیت جس کے ذریعہ اپنے علم ومعرفت کی حفاظت ہو سکے اور کبھی ذکر سے مراد کسی چیز کو قول یا قلب میں حاضر رکھنا ہوتی ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے الذکر ذکران، ذکر القلب وذکر اللسان، یعنی ذکر دو ہیں ایک ذکرِ قلبی دوسرا ذکرِ لسانی (المفردات:۱۷۹) لفظِ ذکران مختلف معانی کے اعتبار سے قرآن کریم میں کوئی پونے دوسو مقامات پر آیا ہے۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ذکر مقامِ ولایت کا وہ منشور ہے کہ جس کو مل جائے وہ ولایت کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور جو اس سے روک دیا جاتا ہے وہ مقامِ ولایت سے معزول اور سبک دوش ہو جاتا ہے۔

ذکر مومن کے قلب کی وہ غذا ہے جب ختم ہو جاتی ہے تو دل مر جاتا ہے اور جسم اس کی قبر بن جاتا ہے، ذکر مومن کے باطن کی وہ آبادی ہے کہ اگر وہ نہ رہے تو باطن ویران ہو جاتا ہے، ذکر اہل اللہ کے حق میں وہ اسلحہ ہے جس کے ذریعہ وہ دشمنِ نفس وشیطان سے مقابلہ کرتے ہیں، اور وہ پانی ہے جس سے جلتے دل کی آگ بجھاتے ہیں، اور ایسی دوا ہے کہ اس کے نہ ہونے سے اُن کے قلوب دوبارہ بیمار ہو جاتے ہیں، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

اذا مرضنا تداوینا بذکرکم فنترک الذکر احیانا فننتکس

یعنی جب بھی ہم بیمار ہوتے ہیں تو تمہارے ذکر سے علاج کر لیتے ہیں، اور جب کبھی تمہارا ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں تو پھر سے بیمار ہو جاتے ہیں۔

ذکر اہلُ اللہ اور اللہ کے درمیان ایک خاص رابطہ اور تعلق ہے جس کے ذریعے وہ پیش آمدہ آفات کو دفع کر لیتے ہیں، مصیبتوں کو دور کر لیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے مصیبتیں ان کے لئے ہلکی ہو جاتی ہیں، جب کبھی ان پر کوئی بلا آتی ہے تو وہ ذکر کی پناہ میں چلے جاتے ہیں اور جو

کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو ذکر ہی کی حفاظت میں چلے جاتے ہیں، پس ذکر ان کی جنت کی ایک کیاری ہے جس میں وہ مزے لوٹتے رہتے ہیں اور مغموم دل کو ذکر مسرور کر دیتا ہے اور ذاکر کو مذکور تک پہونچا دیتا ہے بلکہ ذاکر کو ہی مذکور بنا کے رکھ دیتا ہے۔(فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ)

اعضاءِ انسانی میں سے ہر عضو کے لئے ایک مختصر اور محدود عبادت مقرر کی گئی ہے، اور ذکر زبان اور قلب کی عبادت ہے مگر غیر محدود عبادت ہے بلکہ زبان وقلب کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے معبود کا ذکر ہر حال میں اور ہر وقت کرتے رہیں، خواہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوں، پھر جیسے جنت ایک صاف میدان ہے اور ذکر اس کے پودے اور شادابی کا سبب ہے، اسی طرح انسانوں کے قلوب ویران وغیر آباد ہیں ذکر ان کی رونق وآبادی کا ذریعہ ہے۔

(مدارج السالکین: ۲/۴۴۰)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں ذکر سے مراد اُن الفاظ کا اعادہ وتکرار ہے جس کے کہتے رہنے کا حکم اور اس کی ترغیب دی گئی ہے جیسے الباقیات الصالحات یعنی سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اور اللہ اکبر اور ان جیسے کلمات جیسے لا حول ولا قوۃ الا باللہ، حسبنا اللہ ونعم الوکیل، استغفر اللہ، بسم اللہ وغیرہ نیز دنیا اور آخرت کی بھلائی سے متعلق دعائیں یہ سب ذکر اللہ ہیں، اسی طرح ذکر اللہ کا اطلاق اور اس سے مراد ان اعمال کی پابندی پر بھی ہوتا ہے جو شرعاً بندے پر لازم ہیں یا مستحب ہیں جیسے قرآن کریم کی تلاوت، احادیث شریفہ کا مطالعہ، تعلیم وتعلم، نفل نمازیں وغیرہ۔

پھر ذکر کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے اور ذاکر کو اس کا اجر بھی ملتا ہے، اس زبانی ذکر میں ضروری نہیں ہے کہ اُن اذکار کے معانی بھی مستحضر ہوں، یہ اور بات ہے کہ غلط فہمیوں کے نقصان سے بچنے کے لئے معانی کا استحضار بہتر ہے، اور اگر زبانی ذکر کے ساتھ دل بھی متوجہ ہو تو پھر یہ ذکر کامل ذکر کہلاتا ہے اور اگر زبان وقلب کے ساتھ ساتھ مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور اس کے عیوب سے پاک ہونے کے معانی بھی مستحضر ہو جائیں تو ذکر اعلیٰ ترین اور کامل ترین ہو جاتا ہے، پھر اگر یہ ذکر اِن کیفیات کے ساتھ کسی نیک عمل کے

دوران ہو مثلاً نماز میں یا جہاد وحج وغیرہ میں تو اس کا کمال مزید ہو جاتا ہے اور اخلاص وللّٰہیت کی پختگی تو اس میں چار چاند لگا دیتی ہے اور افضل ترین ذکر بنا دیتی ہے۔

(فتح الباری:۱۱/ ۲۱۲، ۲۱۳)

امام نووی ؒ آدابِ ذکر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذاکر کو چاہیئے کہ وہ آداب کا خاص خیال رکھے، اگر کسی جگہ بیٹھ کر ذکر کر رہا ہے تو قبلہ رُو ہو جائے اور اپنی ہیئت تواضع و عبدیت کی بنائے رکھے، سر جھکا لے، اور اگر مخصوص مجالس میں ذکر نہیں کر رہا ہے تو پھر اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، اگر ذاکر آدابِ ذکر بغیر کسی عذر کے ترک کر دیتا ہے تو اگر چہ گنہ گار نہ ہوگا لیکن ایسا کرنا خلافِ اولیٰ اور ناپسندیدہ ہے، بہتر ہے کہ ذکر کی جگہ بھی پاک صاف اور یکسوئی وتنہائی کی ہو، اسی وجہ سے علماء نے ذکر کا افضل مقام مسجد قرار دیا ہے، اور حضرت ابومیسرہ سے مروی ہے کہ ذکر پاکیزہ مقام پر کیا جانا چاہیئے، اسی طرح ذاکر کا منہ بھی صاف ستھرا ہو، اگر ضرورت ہو تو مسواک یا کسی اور چیز سے دانتوں، مسوڑھوں اور منہ کو اچھی طرح صاف کر لے اس کے بغیر ذکر کرنا مکروہ ہے، ذکر اللہ ہر حال میں محبوب وپسندیدہ عمل ہے، البتہ شریعت کے منع کئے ہوئے مواقع پر ذکر نہیں کرنا چاہیئے، جیسے قضاءِ حاجت کے وقت اور بیوی سے جماع کے وقت اور خطبہ سننے کے دوران، نماز میں، اور غلبۂ نوم کے وقت، البتہ راستوں، وضوخانوں اور غسل خانوں میں مکروہ نہیں ہے (اس لئے کہ یہ جگہیں عام طور سے پاک وصاف ہی رہتی ہیں اور اگر یہ جگہیں پاک صاف نہ ہوں تو یہاں بھی احتیاط ضروری ہے)۔(الاذکار:۱۷)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ اسرارِ ذکر کے تحت فرماتے ہیں کہ ذکر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ اور رکاوٹ نہیں ہے، معرفت کیمیٰ اور سنگ دلی کو دور کرنے کا ذکر سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے، بالخصوص اس شخص کے لئے جو طبعی طور پر ناتواں یا ریاضت ومجاہدے سے عاجز ہو، مگر اس کا دماغ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وساوس سے محفوظ ہو (یعنی سلوک میں مبتدی نہ ہو) نیز حضوری کا حصول بھی اسی ذکر کی برکت ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ذکر کو ''خیر الاعمال'' اللہ کے نزدیک محبوب، آدمی کے درجات میں اعلیٰ ترین درجہ، سونے چاندی کی خیرات سے حتیٰ کہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہوئے مرنے مارنے سے بھی افضل و بہتر عمل قرار دیا ہے'' البتہ جو شخص جسمانی اعتبار سے مضبوط اور صحت کے لحاظ سے تن درست ہو اس کے لئے دیگر ریاضات و مجاہدات بھی نافع ہیں، اور جس کا دماغ وساوس میں مبتلا ہو اس کے لئے محض ذکر میں مشغول رہنے سے نوافل میں مشغول ہونا زیادہ نافع ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ مع الہوامش: ۱/ ۲۶۳)

(ب)

ذکر اللہ کے فضائل و فوائد

گذشتہ صفحات میں ذکر کے سلسلے میں علماء محققین کی چند تحقیقات ذکر کی گئیں تھیں، تا کہ تفصیل معلوم کرنے کا ذوق پیدا ہو، اب قرآن و حدیث کے حوالے سے ذکر کی تاکید اور اس کا اجر و ثواب بیان کیا جارہا ہے۔

سورۃ الاحزاب میں ذکر کی کثرت کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (سورۃ الاحزاب: ۴۱، ۴۲)	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح کے وقت اور شام کے وقت اس کی تسبیح بیان کرو۔

اگلی آیت میں اس کا فائدہ یہ بتلایا گیا ہے کہ یادِ الٰہی کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں، گمراہیوں سے حفاظت رہتی ہے، قیامت میں فرشتوں سے سلامتی و حسنِ استقبال ملے گا اور اجرِ کریم حاصل ہوگا۔

ایک دوسری جگہ ذکر کے حکم کے ساتھ اس سے غفلت نہ برتنے کی بھی تاکید فرمائی ہے:

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ (سورۃ الاعراف:۲۰۵)

اور آپ اپنے دل میں اپنے پروردگار کو یاد کرتے رہیئے گڑگڑاتے اور ڈرتے ہوئے اور ایسی آواز سے جو پکارنے سے کم ہو، صبح کے اوقات میں اور شام میں، اور غافلوں میں سے مت ہوجایئے۔

اس سے اوپر والی آیت میں قرآن مجید سماعت کرنے کے آداب بیان کیئے گئے تھے، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا خاص ذکر ہے، اسی مناسبت سے عام ذکر کے آداب بھی بیان فرمادیئے کہ ذکر کی روح اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یادِ الٰہی زبان سے بھی ہو مگر اس میں چیخ و پکار نہ ہو، اس کے ساتھ دل بھی متوجہ رہنا چاہیئے، دل میں گڑگڑاتے بھی رہیں، حق تعالیٰ کی عظمت کا استحضار ہو جس کی برکت سے دل میں خشیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ جی جی میں ذکر ہوا اور ہلکی آواز سے کلماتِ ذکر بھی گنگناتے رہنا چاہیئے، اسی کے ساتھ مزید شوق ورغبت دلانے کے لئے یہ بھی بتلادیا کہ جو لوگ آپ کے رب کے پاس رہتے ہیں یعنی فرشتے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے حیا نہیں کرتے، اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ دارین کی فوز وفلاح کو ذکر کی کثرت اور پابندی پر موقوف کرکے دکھایا ہے:

وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (سورۃ الجمعہ:۱۰)

اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرتے رہو تاکہ فلاح پاجاؤ۔

ایک موقعہ پر ذاکرین کی تعریف کرتے ہوئے ان کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا گیا ہے

وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (سورۃ الاحزاب:۳۵)

(پچھلی دیگر صفات کے بعد) اور کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

ایک جگہ یادِالٰہی سے غافل کرنے والی چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (سورۃ المنافقون:۹)

اے ایمان والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یادِ الٰہی سے غافل نہ کردے، اگر کوئی ایسا کریں گا تو وہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: یعنی آدمی کے لئے بڑے خسارے اور نقصان کی بات یہ ہے کہ وہ باقی کو چھوڑ کر فانی میں مشغول ہو اور اعلیٰ سے گر کر ادنیٰ میں پھنس جائے، (یاد رکھو!) مال واولاد وہی اچھی جو اللہ کی یاد اور اس کی بندگی سے غافل نہ کرے اگر اس قسم کے دھندوں میں پڑ کر خدا کی یاد سے غافل ہو گیا تو آخرت بھی کھوٹی اور دنیا میں بھی قلبی سکون واطمینان نصیب نہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی:۱۴۶۸)

ایک جگہ ذکر کی ترغیب ایک عظیم خوش خبری کے ساتھ اور خوب صورت ودل نواز پیرائے میں دی:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (سورۃ البقرہ:۱۵۲)

تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری وناقدری مت کرو۔

اس سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہوا ہے جو حق تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسانِ عظیم ہے، اس احسانِ عظیم کو جتانے کے بعد حکم دیا جا رہا ہے کہ اب تمہارا کام یہ ہے کہ ہماری اس نعمت اور احسانِ عظیم کے شکرانے میں ہر لحہ ہمیں یاد رکھو، زبان سے، عمل سے، فکر وخیال سے کسی طرح ہمیں فراموش نہ کرو، یہی شکر گذاری اور قدر دانی کا صحیح طریقہ ہے۔

ایک جگہ ذکر کو سب سے بڑی عبادت قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ

(سورۃ العنکبوت:۴۵)

جو کتاب آپ کی طرف بھیجی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے، نماز قائم کیجئے، یقیناً نماز بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے روکتی ہے، اور یقیناً اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔

علامہ عثمانیؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی نماز بُرائی سے کیوں نہ روکے گی جب کہ وہ اللہ کے ذکر کی بہترین صورت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **واقم الصلوٰۃ لذکری** نماز قائم کرو میری یاد کے واسطے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، یہ وہ چیز ہے جسے نماز، جہاد وغیرہ تمام عبادات کی روح کہہ سکتے ہیں، ذکر نہ ہو تو عبادت ایک بے روح جسم اور بے معنیٰ لفظ ہو کر رہ جاتی ہے، بعض احادیث کی روشنی میں علماء نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے، اصل فضیلت تو اسی کو حاصل ہے یوں وقتی اور عارضی طور پر کوئی عمل ذکر اللہ سے بڑھ جائے تو الگ بات ہے، اس میں بھی اکثر غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس عمل میں فضیلت بھی ذکر اللہ ہی کی وجہ سے آئی ہے، بہ ہر حال ذکر اللہ تمام اعمال سے افضل ہے اور اگر وہ نماز کے ضمن میں ہو تو اور بھی افضل ہوگا، پس بندے کو چاہیئے کہ کسی وقت بھی ذکر اللہ سے غافل نہ ہو، خصوصاً جب کسی گناہ کی طرف میلان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کو یاد کر کے اس گناہ سے دور ہو جانا چاہیئے، قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یاد فرماتا ہے، چناں چہ نماز میں جب بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو یہ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے لیکن جب اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ بندہ کو یاد فرماتا ہے تو یہ اس سے بڑی چیز ہے اسی کو وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ فرمایا گیا ہے، بندہ کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس کو یاد فرمانے کی عظیم نعمت اور شرف و سعادت کی قدر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت کرتا رہے کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام تو بہت

ہیں مجھے کوئی ایسا جامع و مانع عمل بتلا دیجئے (جس کی کثرت کر سکوں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ تیری زبان ہمیشہ اللہ کی یاد سے تر رہا کرے،......

آگے فرمایا **واللہ یعلم ما تصنعون**، یعنی کون اللہ کا ذکر کرتا ہے اور کون نہیں کرتا اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے، لہذا ذاکر اور غافل ہر ایک کے ساتھ اس کا معاملہ بھی اسی نسبت سے ہوگا۔

(تفسیر عثمانی:1070)

ایک جگہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کو عقل منداور صاحبِ سمجھ قرار دیا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۃ آل عمران:۱۹۰)

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں اُن عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال) میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔

یہ چند آیات تھیں جن میں ذکر اللہ کا حکم، اس کی ترغیب اور اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے، جہاں تک ذکر کے سلسلے میں احادیثِ شریفہ کا تعلق ہے تو وہ بھی بے شمار ہیں، ذیل میں چند احادیث بھی ملاحظے کے لئے پیش کی جا رہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا ''کیا میں تم لوگوں کو وہ عمل بتلاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہترین، تمہارے مالک کے نزدیک سب سے پاکیزہ اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بڑھانے والا عمل ہے، اس سے بھی بہتر ہے کہ تم سونا چاندی صدقہ کرو، اور اس سے بہتر ہے کہ تم دشمن سے ایسی سخت جنگ لڑو کہ ایک دوسرے کی گردنیں ٹوٹ جائیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا ضرور بتلائیے یا رسول اللہ! فرمایا ''ذکرُ اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں یاد رکھنا، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کے عفو وانتقام کی شان

ذہن میں تازہ رکھنا اور زبان سے تعریف بجالاتے رہنا، چناں چہ یہ سُن کر حضرت معاذ بن جبلؓ نے کہا: ''پھر تو اللہ کے عذاب سے بچانے میں کوئی چیز ذکر اللہ سے بڑھ کر نہیں ہے''۔
(ترمذی:3377)

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب بندہ میرا ذکر کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میری یاد میں حرکت کرتے ہیں تو میں بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں''۔(ابن ماجہ:3792)
مطلب یہ ہے کہ جب بندہ ذکر اللہ میں مشغول رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید و توفیق بندے کے شامل حال رہتی اور اس کے کام بہ آسانی بناتی رہتی ہے۔

ایک طویل حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت زکریا پیغمبر علیہ السلام نے لوگوں کو بیت المقدس میں جمع کر کے خطبہ دیا اور اس میں پانچ کاموں کی تاکید فرمائی، اُن میں پانچویں بات یہ تھی ''میں تم لوگوں کو ذکر اللہ کی کثرت رکھنے کی تاکید کرتا ہوں، ذکر اللہ (دشمن سے حفاظت ہے، اس) کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو اس کا دشمن پکڑ کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہو، راستے میں اس کو ایک مضبوط قلعہ نظر آئے اور وہ اس مضبوط قلعے میں جا کر پناہ لے لے، اسی طرح بندے کا معاملہ ہے کہ شیطان (اس کا دشمن ہے جس) سے پناہ حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ ذکر اللہ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا''۔(ترمذی:2863)

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص فرشتے ہیں (ان کا کام بس یہی ہے کہ) وہ روئے زمین پر ذکر کی مجلسیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، اگر کسی جگہ چند بندوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ وہ ذکر اللہ میں مشغول ہیں تو وہ فرشتے اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں کہ آجاؤ تمہارے مطلوب لوگ یہاں ہیں، پھر وہ سب فرشتے جمع ہو کر ان ذاکرین کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، یہاں تک کہ آسمان دنیا تک بھر جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ جاننے کے باوجود اُن سے پوچھتا ہے ''میرے بندے کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ عرض کرتے ہیں وہ آپ کی تسبیح، تحمید، تکبیر اور تمجید بیان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں جی نہیں! پوچھتے ہیں: اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ

لیتے تو اس سے کہیں زیادہ عبادت اور تسبیح وتکبیر کرتے، پھر اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: اچھا وہ مجھ سے کیا مانگ رہے تھے؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی جنت مانگ رہے تھے، پوچھتے ہیں کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے؟ عرض کرتے ہیں کہ نہیں بہ خدا نہیں، پوچھتے ہیں کہ اگر دیکھ لیتے تو؟ عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت دیکھ لیں تو اس سے زیادہ شوق و رغبت سے اس کی طلب کرنے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ پھر ان سے پوچھتے ہیں: وہ لوگ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ عرض کرتے ہیں کہ جہنم سے پناہ مانگ رہے تھے، ارشاد ہوتا ہے، کیا انہوں نے جہنم دیکھی ہے؟ عرض کرتے ہیں جی نہیں! فرماتے ہیں کہ اگر وہ جہنم دیکھ لیتے تو؟ خدایا اگر وہ دیکھ لیتے تو اس سے زیادہ ڈرتے اور دور بھاگتے۔ (اس کے بعد فرشتوں سے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم گواہ رہو میں نے ان سب کی مغفرت کردی ہے، یہ سُن کر ان میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ بارِ الٰہا! ان بندوں میں ایک بندہ ایسا بھی ہے جو ذکر کرنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ کسی اور ضرورت سے آ گیا تھا (اس کی بابت کیا حکم ہے؟) ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ایسے (پیارے اور پسندیدہ) بیٹھنے والے ہیں ہے جن کے ساتھ بیٹھنے والا محروم نہیں کیا جاتا''۔

(بخاری:6408)

اس طویل حدیث سے ذکر اللہ اور اس کی مجلسوں کی فضیلت اچھی طرح معلوم ہوگئی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سبق ملا کہ مجلسِ ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ بھی مانگ لینی چاہیئے کہ یہ اس کی خاص عنایت والتفات کا وقت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام ؓ کی ایک مجلس میں تشریف لائے اور ان لوگوں سے دریافت فرمایا کہ ''تم لوگ یہاں بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم لوگ اس مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور ہدایتِ اسلام پر اس کا شکر ادا کر رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں قسم دے کر پھر دریافت کیا کہ ''واقعی تم لوگ یہی کر رہے تھے؟'' انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم! اسی میں مشغول تھے، ارشاد فرمایا: میں نے تم لوگوں کو کسی بدگمانی یا جھوٹ بولنے کی شبہ میں قسم نہیں دلائی بلکہ (بات اصل میں یہ ہے

کہ) جبرئیل نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ تمہاری اس مجلس پر اللہ تعالیٰ (فرشتوں کے سامنے) فخر فرما رہے ہیں''۔(مسلم:2701)

ایک حدیث میں ہے کہ''تین لوگوں کی دعائیں اللہ پاک رد نہیں فرماتے ایک وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو، دوسرے مظلوم، تیسرے انصاف پسند امیر''۔

(شعب الایمان:559)

ایک حدیث میں ہے کہ''قیامت کے دن سات لوگ عرش کے سائے میں ہوں گے جب کہ عرش کے سائے کے علاوہ کہیں اور سایہ نہ ہوگا'' اُن سات میں ایک وہ شخص (بھی ہے) جو تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو (اس کی عظمت و محبت سے) اس کی آنکھیں بہہ پڑیں''
(بخاری:660)

ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔(مسلم:373)

ایک حدیث میں ہے کہ''کوئی بھی جماعت کسی جگہ ذِکر اللہ کے لئے جمع ہوتی ہے تو ضرور اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں، رحمت انہیں ڈھانک لیتی ہے، ان پر سکینت اُترتی ہے اور اللہ تعالیٰ (فخر سے) ان کا ذکر فرشتوں میں کرتے ہیں''۔(مسلم: 2700)

ایک حدیث میں ذکر اللہ کی فضیلت یوں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ''یقیناً مجھے فجر کی نماز کے بعد سے اشراق تک ذکر کرنے والوں کے ساتھ بیٹھنا آلِ اسماعیلؑ یعنی عرب میں سے چار غلاموں کو آزاد کرانے سے زیادہ محبوب ہے، (اسی طرح) نمازِ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک مجلس ذکر میں شریک رہنا چار عرب غلاموں کو آزاد کرانے سے زیادہ محبوب ہے۔

(ابوداؤد:3667)

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور جو ذکر نہیں کرتا ان کی مثال زندے اور مردے کی سی ہے''۔(بخاری: 6407) یعنی ذکر آدمی کی روحانی زندگی ہے اور ذکر سے غفلت روحانیت کی موت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص باوضو اپنے بستر پر آئے اور نیند آنے تک اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے تو وہ (رات بھر اللہ کی عنایت و توجہ میں رہتا ہے) جب بھی کروٹ بدلے اور بیدار ہو اور اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی کوئی بھلائی مانگ لے تو (حالتِ ذکر میں شمار ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ اُسے ضرور عطا فرمائے گا‘‘۔(ترمذی:3526)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں بندے کے ساتھ ویسا ہی ہوں جیسا وہ میرے بارے میں اعتقاد رکھے، اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے اعلیٰ مجمع میں اُسے یاد کرتا ہوں‘‘۔(بخاری:7536)

ایک حدیث میں ہے کہ ’’اللہ کا ذکر اتنی کثرت سے کرو کہ لوگ مجنوں کہنے لگیں‘‘۔
(مسندِ احمد:11674)

ذکر کے فضائل میں نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات عالیہ کے بعد مزید کسی کے قول کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن مناسب ہے کہ چند صحابہ کرامؓ کے آثار بھی نقل کر دیئے جائیں تا کہ اندازہ ہو کہ ان ارشادات کو صحابہ کرامؓ نے عملاً کتنی اہمیت دی تھی۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ فرماتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے تمام بھلائیاں لوٹ لیتے ہیں‘‘۔

حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں: ’’ہر چیز کو چمکانے کا کوئی ذریعہ ہوتا ہے، قلوب کو چمکانے کا ذریعہ ذکر اللہ ہے‘‘۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں: ’’بندہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات کے لئے کوئی عمل ذکر اللہ سے زیادہ مؤثر نہیں کر سکتا‘‘۔

حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ’’جو آدمی ذکر اللہ کی کثرت کرتا ہے وہ نفاق سے بری ہو جاتا ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جتنی عبادتیں لازم کی ہیں اُن سب کی حد اور وقت مقرر کیا ہے، پھر اس میں بھی معذور کا عذر قبول فرمایا ہے، سوائے ذکر کے کہ نہ اس کی مقدار متعین کی ہے اور نہ ہی کوئی عذر معتبر ہے''۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے۔ آمین

(ج)

ذکر اللہ سے غفلت کے نقصانات

گذشتہ صفحات میں ذکر اللہ کے جس قدر فضائل کتاب وسنت کی روشنی میں سامنے آئے ہیں انہی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس سے غفلت کتنے بڑے بڑے نقصانات اور دنیا و آخرت کی محرومیوں کا سبب بن سکتی ہے، مزید کچھ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن ترتیب کے مطابق چند باتیں اس عنوان کے تحت بھی بیان کی جارہی ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذکر اللہ کی تاکید کرنے کے بعد صاف طور پر ارشاد فرمایا:

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ — اور آپ ذکر اللہ سے غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہو جائے۔ (سورۃ الاعراف:۲۰۵)

ظاہر ہے کہ یہ حکم خود بتلا رہا ہے کہ ذکر اللہ سے غافل ہو جانا مذموم و مکروہ عمل ہے، جب مذموم ہے تو نقصان دہ بھی ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ — اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور تسبیح و سجدہ میں لگے رہتے ہیں۔

(سورۃ الاعراف:۲۰۶)

جس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ذِکرُ اللہ سے غفلت استکبار ہے، جب کہ استکبار ہی

ابلیس کے ملعون و منحوس بننے کا سبب ہوا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''یقیناً شیطان اپنی سونڈ آدمی کے دل کے اوپر رکھے رہتا ہے، اگر دل کو ذاکر پاتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر ذکر اللہ سے دل کو غافل پاتا ہے تو ڈس دیتا ہے''۔ (شعب الایمان: 536)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جب بھی لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں، اور اس حال میں اُٹھیں کہ اس مجلس میں اللہ پاک کا کچھ بھی ذکر نہ کریں تو گویا کہ وہ گدھے کے مردار پر سے اُٹھے ہوں، اور یہ مجلس قیامت کے دن ان کے حق میں باعث حسرت ہوگی''۔ (ایضاً: 537)

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بنی آدم اگر تو نے مجھے یاد رکھا تو گویا میرا شکر ادا کیا اور اگر مجھے بھلا دیا (یعنی ذکر سے غافل رہا) تو تو نے میری ناشکری کی''۔

(الترتیب والترہیب: 2182)

ایک حدیث میں (جو پیچھے گذر گئی) ذکر اللہ سے غفلت برتنے والے کو مردے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

تمام احادیثِ شریفہ کا حاصل اور کُھلا سبق یہ ہے کہ ہر مومن کو بالخصوص سالکین راہِ خدا کو ذِکرُ اللہ کی کثرت کرنی چاہیئے اور چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے آٹھوں پہر اللہ کے ذکر میں مست رہنے کے علاوہ کوئی وقت مقرر کر کے بہ طور خاص بھی اللہ کا ذکر کرنا چاہیئے، کسی صورت اس عمل سے غفلت نہیں برتی چاہیئے۔ تمام مشائخِ تربیت نے اس کا اہتمام کیا اور کرایا ہے۔ حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

۷

کسبُ الحلال

حلال کمائی کا اہتمام اور اس کی فکر

(الف)

کسبِ حلال کی اہمیت وضرورت

دنیا میں انسان ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے واسطے کسبِ مال کا محتاج ہے، مال کمانے کے مختلف ذرائع اللہ تعالیٰ نے بنا رکھے ہیں، اِن ذرائع کا صحیح استعمال یعنی شریعتِ اسلامی کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کسبِ حلال کہلاتا ہے اور غلط استعمال کو کسبِ حرام کہتے ہیں، اسلام کہتا ہے کہ مال ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے، مال کمانا چاہیئے مگر حلال اور جائز طریقوں سے کمانا چاہیئے ظلم وزیادتی کے راستے سے جو بھی مال حاصل کرے گا وہ ناحق اور حرام ہوگا۔ اس کے بعد پہلے مال کمانے کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں اس کے بعد حلال کمانے کی اہمیت کا بیان ہوگا۔

مال کی اہمیت بتلاتے ہوئے مشہور محدث حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ’’مال پہلے زمانے میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے زمانے میں مال ہی مومن کی ڈھال اور اس کی حفاظت کا وسیلہ ہے، اگر یہ روپیہ پیسہ ہمارے پاس موجود نہ ہوتا تو مال دار لوگ ہم کو ٹیشو پیپر بنا ڈالتے، جب ضرورت ہوتی منھ ہاتھ پونچھ کر ہمیں ایک طرف کر دیتے، اس لئے

جس کے پاس مال ہے اس کو چاہیئے کہ اس کی حفاظت اور اضافے کی فکر کرتا رہے، اس لئے کہ یہ (ایمان کے ضعف کا) ایسا دور ہے کہ اگر محتاجی کا سامنا ہوا تو ڈر ہے کہ آدمی اپنے دین ہی کو بیچ ڈالے گا، (اور حلال کمانے کی کوشش کرے کیوں کہ) حلال میں اسراف کی گنجائش نہیں رہتی''۔(شرح السنۃ:4098)

یعنی حلال وحرام کی تمیز کے ساتھ جو مال کمایا جاتا ہے تو وہ مال عام طور سے اتنا زیادہ ہوتا نہیں کہ فضول خرچی کی جائے، یا مطلب یہ ہے کہ حلال کا اہتمام متقی کرتا ہے اور متقی فضول خرچی جیسے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا، بہ ہر حال حضرت سفیان ثوریؒ کی ان باتوں سے صاف معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت اور اس کی برکات سے دوری ہو جانے کی وجہ سے ایمان ویقین اور حالاتِ زمانہ میں جو تبدیلیاں آگئی ہیں اُن کی روشنی میں اب بہتر یہی ہے کہ آدمی مال کمانے کی طرف دھیان دے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو بھی مال اُسے عطا فرمائے اس کی حفاظت اور اس کی زیادتی کی فکر کرنا اور صحیح استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ کسی بزرگ سے کہا گیا کہ مال آپ کو دنیا سے قریب کر رہا ہے تو فرمایا ''اگر مال مجھے دنیا سے قریب کر رہا ہے تو وہی مجھے دنیا سے بچا بھی رہا ہے''، یعنی ذلت ورسوائی اور مخلوق کی محتاجی واحسان سے بچنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ''وہ مال جس کا خدا تعالیٰ کو حساب بھی دینا پڑتا ہے مخلوق کے محتاج بننے سے بہتر ہے''۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ یعنی خوفِ خدا اور اس کے احکام کی رعایت کے ساتھ کسی کے پاس اگر مال ہو اور کمانے اور خرچ کرنے دونوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے تو یقیناً یہ بات عقل وحکمت کے موافق ہی ہے، اسی طرح مقولہ مشہور ہے (درہم زخموں کا مرہم ہے) حدیثِ مرفوع میں خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ ''ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ آدمی کو روپیہ پیسہ ہی کام آئے گا''۔(مرقاۃ المفاتیح: ۳۳۱۱/۸)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے فرائض وواجبات ادا کرنے کے بعد کسبِ معاش کی فکروں میں لگنا اور ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کے محتاج رہنے کے بجائے خود مختار ہو جانا

بہت ضروری ہے، نہ صرف عقلی اعتبار سے ضروری ہے بلکہ شرعاً بھی ضروری ہے، بلا وجہ اس سے لاپروائی برتنا عام لوگوں کے حق میں تو ایک طرح معصیت اور گناہ ہی ہے، خصوصاً موجودہ دور میں اپنے دین وایمان اور عزت وآبرو کی حفاظت اور سماجی تعلقات کی خوش گواری بھی اسی میں ہے، اسی کے ذریعے اہل وعیال کو خوش رکھا جاسکتا ہے، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور محتاجوں کی مدد کی جاسکتی ہے، تعلیم وتبلیغ کے شعبوں کو زندہ رکھا جاسکتا ہے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

(ب)

اسلام میں کاروبار کرنے اور کمانے کا حکم:

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف عبادت کرنے ہی کا حکم نہیں دیا ہے، شادی بیاہ، کاروبار اور معیشت ومعاشرت کا بھی پابند کیا ہے، البتہ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان جو بھی کریں وہ عمدہ اور اعلیٰ درجے کا کریں، قرآن میں کسب معاش کے اسباب کو بہ طور احسان کے ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً اور ہم نے دن کو ذریعۂ معاش بنایا۔

(سورۃ النباء:۱۱)

یعنی عام طور سے کاروبار اور کمائی کے دھندے دن ہی میں کئے جاتے ہیں، جس کے ذریعہ بال بچوں کی روزی روٹی اور ضروریاتِ زندگی پوری ہوسکیں۔

سورۂ اعراف میں بھی اسبابِ معاش فراہم کرنے کو بڑی نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (سورۃ الاعراف:۱۰)

اور یقیناً ہم نے تم لوگوں کو زمین میں بسایا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے روزیاں رکھ دیں، (لیکن) تھوڑے ہی لوگ ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر اور اس کے اندر اپنے بندوں کے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کر دی ہیں تو اب بندوں کا کام ہے کہ اس کی دی ہوئی صحت وعقل سے ان روزیوں کو تلاش کریں، کمائیں اور زندگی کا اطمینان وسکون حاصل کریں، یہی نہیں بلکہ ان احسانات پر اپنے مہربان رب کا شکر بھی خوب ادا کیا کریں اور شکر میں یہ بھی داخل ہے کہ ان نعمتوں کو اس کی بندگی کا وسیلہ بنائیں بغاوت کا ذریعہ نہ بنائیں۔

سورۃ البقرہ میں حج کے دوران بھی تجارت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ (سورۃ البقرہ:۱۹۸)

تم پر کوئی حرج نہیں اگر تم دورانِ حج اپنے رب کا فضل یعنی روزی تلاش کرلو۔

آیت میں دو باتیں قابلِ غور ہیں ایک تو یہ کہ جب اسلام میں حج کا حکم دیا گیا اور مسلمان حج کے لئے نکلے تو انہیں اشکال ہوا کہ حج کے دوران تجارت کرنا کہیں اخلاص اور رضائے الٰہی کے مقصد کے خلاف تو نہیں ہوگا، اس اشکال کو رفع کرتے ہوئے فرمایا: نہیں! کوئی حرج نہیں ہے، مناسک وفرائض ادا کرتے ہوئے فارغ وقت میں حاجی کچھ کاروبار کر لینا چاہے تو کر سکتا ہے، بالکل منع نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جگہ جگہ روزی کو اپنے فضل کا نام دیا ہے، یہاں بھی تجارت کی اجازت فضلِ رب کے نام سے دی ہے کیوں کہ اس کے بغیر کارخانۂ عالم کا سارا نظام تہس نہس ہو کر رہ جائے گا، جب ایسا ہے تو اس کی فکر سے غافل ہو بیٹھنا اور توکل کے نام پر دوسروں کا بوجھ بن جانا اور فضلِ رب سے بے پروائی دِکھانا مذموم ومعیوب حرکت

ہے، جیسا کہ آج کل عام طور سے دیکھا جا رہا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں آدھی رات یا اس سے کچھ کم زیادہ نوافل پڑھنے کا حکم تھا، اس میں قیام طویل کرنے کے لئے تلاوت طویل کی جاتی تھی، حتیٰ کہ بعض لوگوں کے پیر وَرم کر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں بڑی رعایت اور پورا اختیار عطا فرمایا، اس مہربانی کی وجوہات میں ایک یہ بات بتلائی کہ اس سے بیماروں کی رعایت مقصود ہے ایک مجاہدین کو راحت دینا مقصود ہے اور ایک بات یہ ہے کہ

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ
(سورۃ المزمل:۲۰)

اور کچھ لوگ زمین پر چل پھر کر اللہ تعالیٰ کا فضل یعنی روزی روٹی تلاش کرتے ہیں۔

یعنی دن بھر کاروبار یا محنت مزدوری میں تھک کر رات کو اتنی طویل عبادت نہیں کر پا رہے ہیں اس لئے اب آدھی یا اس سے کم زیادہ رات نوافل پڑھنے کے بجائے حسبِ سہولت پڑھ لینے کی رعایت کر دی گئی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لئے کسب کرنا خواہ مزدوری کے ذریعے خواہ کسی ملازمت کے ذریعے بہت اہم کام اور بڑی عبادت ہے۔

سورۃ الجمعہ میں فرمایا کہ جب نماز جمعہ کے لئے اذان دے دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر نماز کی تیاری میں لگ جاؤ

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ
(سورۃ الجمعہ:۱۰)

پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی اپنی روزی روٹی تلاش کرنے میں لگ جاؤ۔

یہ چند آیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن میں بندوں کی ضروریاتِ زندگی کے سلسلے میں بھی احکام موجود ہیں، آیات تو اور بھی بہت سی ہیں لیکن یہاں صرف چند آیتوں کے ذریعے سالکین کو بتلانا مقصود ہے کہ یہ بھی اہم کام اور ضروری عبادت ہے، آگے اس سلسلے

کی احادیثِ نبویہ پیش کی جارہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''کوئی آدمی اپنے ہاتھوں کے عمل (یعنی محنت مزدوری) کی کمائی سے زیادہ بہتر روزی نہیں کھاتا''۔ (بخاری: 2072)

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے (عبادتی) فرائض کے بعد (اہم فریضہ) کسب حلال کی تلاش ہے'' (شعب الایمان: 8741)

ایک حدیث میں ہے کہ صحابیٔ رسول مقدام بن معدیکربؓ کی ایک باندی تھی وہ دودھ بیچتی تھی اور حضرت رقم وصول کرتے تھے، کسی نے کہا: سبحان اللہ! یہ آپ کیا کررہے ہیں، دودھ بیچ کر پیسہ بناتے ہیں؟ (یا یہ کہ تعجب ہے آپ اتنے بڑے آدمی ہوکر ایسا معمولی اور گھٹیا کاروبار کررہے ہیں؟) انہوں نے فرمایا: ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں (کسی بھی جائز کاروبار کو ذریعۂ معاش بنایا جاسکتا ہے) میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ لوگوں پر ایسا دور آنے والا ہے جس میں سوائے روپۓ پیسے کے اور کچھ کام نہ دے گا''۔

(مسندِ احمد: ۴/۱۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی جائز اور حلال کاروبار کے ذریعے مال کمانا چاہیۓ وہ ضرورت کی چیز ہے، ورنہ آدمی جب محتاج ہوجاتا ہے تو بسا اوقات اندیشہ ہوجاتا ہے کہ دین کا تک سودا کر بیٹھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت نافعؓ ملک شام اور ملکِ مصر میں اپنا مال بھیج کر تجارت کیا کرتے تھے، اُن کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ عراق کو مال بھیج کر دیکھیں تو انہوں نے حضرت عائشہؓ سے مشورہ کیا، انہوں نے فرمایا: ایسا مت کرو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے لئے کوئی ذریعۂ معاش بنادیں تو بنا سخت ضرورت اور اہم وجہ کے اُسے نہ چھوڑے۔ (ابن ماجہ: 2174)

مطلب یہ ہے کہ جب ایک جگہ تمہارا کاروبار اچھا ہی چل رہا ہے تو ایسا کام مت کرو جس میں خطرہ ہو، اور بنا بنایا کاروبار بگڑ جائے، اس سے بھی کسبِ حلال اور اس کے ذرائع کے

تحفظ کا پتہ چلتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”دو آدمیوں کے علاوہ کسی پر رشک وفخر درست نہیں ہے۔ان میں سے ایک وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ (خوب) مال عطا فرمائیں اور پھر اُسے اس مال کو خیر کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں“۔(ابن ماجہ:4208)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کچھ مدد طلب کی تو آپ نے فرمایا ”کیا تمہارے گھر میں کوئی (قابلِ فروخت) چیز ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک چھوٹا بچھونا ہے جس میں سے ہم کچھ بچھا لیتے ہیں اور کچھ اوڑھ لیتے ہیں، ایک پیالہ ہے جس میں پانی پی لیتے ہیں، فرمایا: ”دونوں چیزیں یہاں لے آؤ“ وہ لے آئے، آپ ﷺ نے ان دونوں چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اعلان فرمایا ”کوئی ہے جو ان چیزوں کو خرید لے“ ایک صحابیؓ نے عرض کیا میں ایک درہم میں لے لیتا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کوئی اور خریدار ہے جو اس سے زائد میں لے سکتا ہو؟ ایک صحابیؓ نے عرض کیا میں دو درہم میں لے لیتا ہوں، تو آپ نے وہ دو چیزیں ان صحابیؓ کو فروخت کردیں اور ان سے دو درہم لے کر اُن انصاری کو دیا اور فرمایا ”ایک درہم سے غلہ خرید کر گھر میں دے دو اور ایک درہم سے کُلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ، چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا، آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کُلہاڑی میں لکڑی کا دستہ لگا کر ان کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا ”یہ کُلہاڑی لے کر جنگل میں چلے جاؤ، روزانہ لکڑی کاٹ کے لایا کرو اور شہر میں بیچ دیا کرو، پندرہ دن تک میں تمہیں یہاں نہیں دیکھوں گا“ انہوں نے ایسا ہی کیا پندرہ دن میں دس درہم کمائے اور ان سے کچھ کپڑا اور کچھ غلہ خرید لیا (پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے فرمایا ”(یہ محنت کر کے کمانا تمہارے حق میں اس سے بہتر ہے کہ کل قیامت میں سوال کا داغ اپنے چہرے پر لے کے آؤ“۔(ابوداؤد:1641)

ایک حدیث میں ہے کہ ”تم میں سے کوئی آدمی اپنی رسی لے کر جنگل میں جائے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اُٹھا کر لائے اور اسے بیچ کر پیسہ بنائے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے

بے آبروئی سے بچالے تو یہ لوگوں سے مدد مانگنے سے بہتر ہے، جب کہ یہ بھی پتہ نہیں کہ دیں گے یا نہ دیں گے''۔(بخاری:1471)

ایک حدیث میں ہے کہ''اللہ تعالیٰ متقی اور گم نام مال دار کو پسند فرماتے ہیں''یعنی ایسا مال دار جو تقویٰ شعار بھی ہو اور شہرت سے بھی دور رہتا ہو''۔(مسلم:2965)

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کہیں بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے، اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تشریف لے آئے، آپ کے سر مبارک پر غسل کے آثار نظر آ رہے تھے، ہم نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ کے چہرے پر بشاشت دیکھ رہے ہیں، فرمایا''صحیح ہے''۔ پھر ہم لوگ مال داری کے سلسلے میں مذاکرہ کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا''مال داری اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والے کے لئے کچھ مُضر نہیں ہے، اور صحت مندی متقی کے لئے مال داری سے بھی بہتر چیز ہے، اور بشاشت و خوش گواری بڑی نعمت ہے''۔(ابن ماجہ:2141)

ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے ایک صاحب بہت چُستی اور تیزی سے گذرے تو وہاں موجود صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کی یہ چُستی اور پُھرتی راہِ خدا میں ہوتی تو کیا اچھا ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا''اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کے لئے کمانے کو نکلا ہے تو یہ راہِ خدا میں ہے، اگر بوڑھے والدین کی ضرورت کے لئے نکلا ہے تو یہ بھی راہِ خدا میں ہے، اور اگر اپنی حاجات کے لئے نکلا ہے کہ سوال کی ذلت سے محفوظ رہے تو یہ بھی راہِ خدا میں نکلنا ہے، ہاں اگر شان و شوکت اور دکھاوے کے لئے کمارہا ہے تو یہ راہِ شیطان میں ہوگا۔
(طبرانی فی الکبیر:282)

ایک حدیث میں ہے کہ''اللہ تعالیٰ ہنر جاننے والے مومن سے محبت فرماتے ہیں''۔
(طبرانی فی الاوسط:8934)

ہنر مند آدمی اپنی صلاحیت اور قوتِ بازو سے کسب کرے گا اور یہ کمائی پاکیزہ کمائی ہے، نیز جب وہ ہنر مند ہے تو ضرورت پر اس کے ذریعہ کمائی کر سکتا ہے دوسروں کا محتاج بن کر اور سوال کر کے ذلیل نہیں ہوتا، ایسے لوگ ظاہر ہے کہ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص اپنی محنت مزدوری سے تھک کر سوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیتے ہیں''۔(طبرانی فی الاوسط:17520)

مذکورہ بالا آیات واحادیث واضح طور پر پیغام دے رہے ہیں کہ مال آدمی کی اس دنیا میں بہت بڑی ضرورت ہے، اور انسانی سماج کی حیات اور بقا اسی سے وابستہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللهُ لَكُمْ قِيَامًا (مال جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری حیات اور قیام کا وسیلہ بنایا ہے) بلکہ یہ مال آخرت کی کامیابی اور جنت کے درجات حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے، اس لئے مال کمانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے، بے شک روزی مقدر ہے لیکن اس کے لئے تدبیر کا حکم بھی دیا گیا ہے، آج کل لوگ اسے تصوف وتوکل کے خلاف سمجھنے کی بنیادی غلطی میں مبتلا ہیں، بلکہ بعض نادان تو مقدّر کا بہانہ کرکے دوسروں کا بوجھ بنتے ہیں یا سوال کی ذلت میں مبتلا ہوتے ہیں یا اہل وعیال کو مصیبت میں ڈالے رکھتے ہیں، یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات نہ دین ہے نہ بزرگی بلکہ سراسر حماقت اور دین سے بے خبری پر مبنی ہے، ہاں! حرص وطمع اور حبِّ مال اتنی جو خدا تعالیٰ کی یاد اور احکام سے غافل کردے یقیناً بُری بات اور مذموم صفت ہے۔

(ج)

اکلِ حلال کے فوائد

مال کمانے کے فوائد وفضائل تو معلوم ہوگئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مال کمانے میں آدمی ایسا لگ جائے کہ حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھے، یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سب اسی مال کے فوائد وفضائل ہیں جو حلال ہو اور حرام مال تو سراسر خسارہ نقصان اور دارین کی بربادی کا ذریعہ ہے، اگلے باب میں اس کی تفصیل آئے گی یہاں ہم اکلِ حلال کے فضائل وفوائد بیان کررہے ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (سورۃ المومنون:۵۱)

اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور بہترین اعمال کرو، بے شک میں تمہارے اعمال کو جانتا ہوں۔

دوسری جگہ یہی بات تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے بھی فرمائی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (سورۃ البقرۃ:۱۷۲)

اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ، اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو۔

تمام چیزوں کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے، خالق کو ہی زیادہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کس چیز کا کیا مزاج ہے اور اس کے لئے کیا کیا چیزیں نافع اور فائدہ مند ہیں اور کیا کیا چیزیں مُضر و نقصان دہ ہیں، اس نے کس چیز میں کیا تاثیر رکھی ہے۔ اسلام میں حلال وحرام کا جو حیرت انگیز و بے مثال نظام ہے اس کا مقصد جہاں بندوں کی بندگی اور وفا شعاری کا امتحان ہے وہیں خود ان کو دونوں جہاں کے مضرات سے بچانا اور فائدے پہونچانا بھی ہے، نیز آپس میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے ضرر سے بچانا بھی حلت وحرمت کے مقاصد ومصالح میں داخل ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ انہی دو آیتوں کی تلاوت کر کے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ پاک ہے صرف پاکیزہ چیزیں قبول فرماتا ہے (دیکھو اِن آیات میں) اس نے مومنین کو وہی حکم دیا ہے جو اپنے رسولوں کو دیا ہے۔'' (مسلم:1015)

اس حدیث سے اکلِ حلال کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کیا مقام ہے اور اس نے اپنے بندوں کو خواہ وہ نبی ہوں یا اُمتی اکل حلال کا پابند فرمایا ہے، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ کے بعد وَاعْمَلُوا صَالِحًا کی ترتیب بتاتی ہے کہ اکلِ حلال سے اعمالِ صالحہ وجود میں آتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ حلال بالکل واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، لیکن ان کے درمیان ایسی مشتبہ چیزیں بھی ہیں (جن کا حلال وحرام ہونا واضح نہ ہو) تو اب جو ایسی مشتبہ چیزوں سے بچے گا تو وہی اپنے دین اور آبرو کو بچالے جائے گا، اور جو شبہات میں پڑے گا تو (اندیشہ ہے کہ) حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا''۔(بخاری:52)

معلوم ہوا کہ اکل حلال کا اہتمام کرنے والے کو حرام تو حرام مشتبہ چیزوں سے بچنا بھی ضروری ہے، اور جیسے کھانے پینے میں اس کا اہتمام ضروری ہے کمانے میں بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''جس چیز میں کھٹک ہو اُسے چھوڑ کر جس (کے حلال ہونے) میں اطمینان ہے اس چیز کو اختیار کیا کرو، کیوں کہ سچائی میں دلی اطمینان کی شان ہے اور جھوٹ کھٹک پیدا کرتا ہے''(ترمذی:2518)

ایک حدیث میں ہے کہ'' آدمی متقیوں میں اس وقت تک شمار نہیں ہوسکتا جب تک بعض جائز چیزوں کو بھی ناجائز میں مبتلا ہونے سے بچنے کے لئے چھوڑ نہ دے''۔(ابن ماجہ:4215)

ایک حدیث میں ہے کہ'' جو شخص حلال مال کمائے، اس میں سے کھائے کھلائے اور پہنے اوڑھے (یعنی ہر چیز میں حلال مال کا استعمال کرے) تو یہ مال اس کی زکوٰۃ یعنی بدن کی پاکیزگی اور جہنم سے نجات کا سبب ہو جائے گا''(الترغیب والترہیب:2520)

ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اپنی کمائی پاکیزہ رکھی، اپنے باطن کو صالح رکھا اور اپنے ظاہر کو باوقار رکھا اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھا اس کے لئے خوش خبری ہے''۔

(الترغیب والترہیب:2521)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں **كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا** والی آیت پڑھی گئی تھی تو حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! میرے لئے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا فرما دیجئے یعنی ایسا بندہ جس کی دعا رد نہیں ہوتی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اے سعد! اپنا کھانا پینا پاکیزہ رکھو مستجابُ الدعوات ہو جاؤ گے''۔(الترغیب والترہیب:2522)

(د)

کسبِ حرام اور اکلِ حرام کے نقصانات

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام کا نقصان بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ایک آدمی لمبے سفر پر نکلا، گرد و غبار سے جسم اور سر اَٹے ہوئے ہیں (سفر کی مشقتوں سے عاجز ہوکر یا راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے) اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا کر کہہ رہا ہے یا رب! یا رب! (لیکن اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمارہے ہیں، ظاہر ہے کہ) اس شخص کی دعا کیوں سُنی جائے؟ جس کا کھانا حرام کا ہے، کپڑے حرام کے ہیں، بلکہ اس کے جسم کا گوشت پوست حرام سے پلا بڑھا ہے''۔(مسلم:1015)

حرام خوری اور حرام کمائی کا یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ بندہ دعا کی قبولیت اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے محروم ہوجاتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ تو بہت کریم ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''لوگوں پر ایسا وقت آنے والا ہے کہ آدمی کو اس کی کوئی پروا بھی نہ ہوگی کہ وہ جو لے رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام؟''۔(بخاری:2059)

ظاہر ہے کہ اس خبر دینے کا مقصد ہی مسلمانوں کو حرام کے نقصان سے ڈرانا ہے کہ اگر ایسا ہونے لگے تو اُنہیں لین دین میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت فرمائے، جب ان پر اللہ نے مردار کی چربی حرام کردی تو وہ لوگ (حیلے کرتے ہوئے) اس کو پگھلا کر جما لیتے پھر بیچ کر اس کی قیمت استعمال کرلیتے تھے''(بخاری:2236)

معلوم ہوا کہ حرام خوری لعنتِ الٰہی کا سبب ہے، خواہ بہانے بازی کر کے ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہے اس کو دھوکہ کیسے دیا جاسکتا ہے؟

ایک حدیث میں ہے کہ ''جنت میں وہ جسم نہیں داخل ہوسکتا جو حرام سے پرورش پایا ہو، ایسے جسم جو حرام سے پلے ہوں ان کے لئے جہنم ہی زیادہ موزوں ہے'' ۔(دارمی:2776)

ایک حدیث میں ہے کہ ''جس شخص نے دس درہم کا کپڑا خرید (کر پہنا) جس میں ایک

درہم حرام کا بھی تھا تو اللہ تعالیٰ جب تک وہ اس کپڑے کو پہنا ہوا ہے اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرماتے‘‘۔(شعب الایمان:6114)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:’’اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی جان ہے آدمی حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈال لیتا ہے جس کی وجہ سے چالیس روز تک اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا‘‘۔(طبرانی فی الاوسط:6495)

ایک حدیث میں ہے کہ’’آدمی مٹھی بھر مٹی لے کر اپنے منہ میں بھر لے یہ اس سے بہتر ہے کہ اپنے منہ میں اللہ کی حرام کی ہوئی چیز ڈالے‘‘۔(مسند احمد:7490)

ایک حدیث میں ہے کہ’’جو کوئی آدمی حرام ذریعے سے مال کمائے پھر اس کے ذریعے (نیکی کے کام مثلاً) صلۂ رحمی کرے، یا صدقہ خیرات کرے یا راہِ خدا میں صرف کرے تو ان سب اعمال کو (قیامت کے دن) جمع کر کے جہنم میں ڈال دیا جائے گا‘‘۔(الترغیب والترہیب:2528)

ان تمام احادیث شریفہ سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ حرام کمانا اور حرام کھانا اسلام میں سخت ناپسندیدہ کام ہے، نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ دنیا اور آخرت کی تباہی کا سبب ہے، دنیا کی ذلتیں مصیبتیں اور آخرت میں عذابِ الیم حرام خوری کی وجہ سے نصیبے میں آتا ہے، حرام خوری جنت سے محرومی اور جہنم میں داخلے کا سبب بنتی ہے، اس لئے ایک مسلمان بالخصوص دین دار بننا چاہنے والے کو اکلِ حلال کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے اور حرام کمائیوں سے بلکہ مشتبہ اور قابلِ کھٹک کاموں کے ذریعہ مال کمانے اور کھانے سے بچنا چاہیئے، حلال کی ایک روٹی حرام کی مزے دار غذاؤں سے کہیں بہتر ہے، یاد رکھئے! زندگی تنگی تُرشی اور اچھی بُری بہ ہر حال گذر جانے والی ہے، اصل مسئلہ تو قبر و حشر اور آخرت کی ابدی زندگی کا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ

کسبِ حلال کے لئے کوشش کرتے رہیں، خالی نہ رہیں، علم حاصل کریں، ہنر سیکھیں، محنت مزدوری کریں، تجارت کریں، زراعت کریں اور جو ممکن راستے ہوں کسبِ حلال کے لئے ضرور اختیار کریں۔

۸

اِتّباعُ السنة

سنتوں کی پیروی

(الف)

اتباعِ سنت کی حقیقت اور ضرورت

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اپنے بندوں میں سے انتخاب کر کے پہلے ان کی غیب کے راستوں سے تربیت فرماتے ہیں، یعنی ان کی عادات و اطوار کو فطرتاً اعلیٰ درجے کی بناتے ہیں، وہ پیدائشی طور پر ایسی موزوں طبیعت اور معتدل مزاج رکھتے ہیں جو تمام سمجھ دار اور سلیم الفطرت انسانوں کے لئے قابلِ قبول اور پسندیدہ و مرغوب ہوتا ہے، ان کے حسنِ ظاہر کو کشش اور کھنچاؤ کے لائق بناتے ہیں، پھر تعلیماتِ شریعت کے ذریعے اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں، اس کے بعد ان کے اقوال، اعمال اور اخلاق کو پوری انسانیت کے لئے اُسوۂ حسنہ اور معیارِ زندگی قرار دے کر انسانیت کو بالخصوص مسلمانوں کو اُن کی اتباع کا پابند بناتے ہیں، چناں چہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نسل، خاندان، وطن، حسنِ ظاہر اور علم و عمل اور اخلاق کے اعتبار سے تمام انسانیت میں ممتاز اور نمایاں تھے اور آج بھی ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود شہادت دیتے ہوئے فرمایا: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی آپ زبردست اخلاق پر (سنوارے گئے) ہیں۔ چوں کہ وہ سب سے اعلیٰ اخلاق اور بہترین صفات کے حامل ہیں اس لئے ان کو اپنے تمام بندوں کے لئے زندگی کا بہترین نمونہ

قرار دیا، اور ارشاد فرمایا: لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں (زندگی گذارنے کا) بہترین نمونہ ہے، گویا اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہمارے رسول کو ہم نے اپنی مرضی کے مطابق سنوار کر اور انسانی اقدار کا اعلیٰ معیار بنا کر تمہارے لئے ایسا ماڈل قرار دیا ہے کہ اگر تم اپنے کو علم وعمل اور اخلاق کے اعتبار سے اُن جیسا بنالو تو تم بھی ہمارے محبوب بن سکتے ہو اور نہ بناؤ تو پھر تمہاری قبولیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ پھر ایک جگہ انہی کی زبان سے کہلوایا اِتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے پیار کرے گا۔ اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ایک مسلمان کے لئے اتباع سنت کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے۔

لغت کے اعتبار سے اتباع کے معنیٰ ہیں اقتدا اور پیروی کرنا، کسی کے پیچھے چلنا، اور السنۃ کے معنیٰ ہیں طریقہ، اور شریعت میں سنت اس دینی طریقہ (حیات) کو کہتے ہیں جو فرض وواجب کے درجے میں نہ ہو، پس سنت وہ اعمال ہیں جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مواظبت یعنی پابندی فرمائی ہو البتہ کبھی کبھار ترک کر دیا ہو، پس اگر آپ کا پابندی کرنا عبادت کے طور پر ہو تو وہ اعمال سننِ ہدایت کہلاتے ہیں، ان کی پابندی کرنا تکمیلِ دین کے لئے ضروری ہے اور خلاف ورزی شریعت میں ناپسندیدہ اور بُرا ہے، اور جو اعمال آپ نے بطور عادت کئے ہیں وہ سننِ زوائد کہلاتے ہیں، ان پر عمل کرنا ہدایت وسعادت ہے لیکن ترک کرنا گناہ نہیں ہے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کھانے پینے، پہننے، اُٹھنے بیٹھنے سے متعلق عادات ہیں (کہ ان کا اختیار کرنا موجب برکت اور باعثِ سعادت وہدایت ہے لیکن اگر ترک ہو جائیں تو مواخذہ اور گناہ نہ ہوگا۔ (التعریفات: ۱۱۷)

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شریعت میں سنت کا اطلاق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قول، فعل اور تقریر یعنی کسی عمل کو برقرار رکھنے پر بھی ہوتا ہے اور ان عادات پر بھی ہوتا ہے جنہیں آپ نے ضروری قرار دئے بغیر عملاً اختیار فرمایا ہے، لیکن یہاں ''اتباع سنت'' سے مقصود عام ہے یعنی تعلیماتِ نبوی کا اتباع، خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی پھر خواہ فرض وواجب درجے کے ہوں یا

مستحب ومندوب حیثیت کے۔صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں آپ کی سنتوں کے اتباع کا یہی تصور تھا۔

(ب)

اتباعِ سنت کے فضائل وفوائد

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ایک خاص حکم کے درمیان عام قاعدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (سورۃ الحشر:۷)

(مالِ فئے میں سے) رسول جوتم کو دے دیں وہ لے لو،جس سے روکیں رک جاؤ، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ سخت پکڑ کرنے والا ہے۔

اس کی تفسیر میں علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں ’’اسی طرح رسول کے تمام احکام اور نواہی کی پابندی رکھو،رسول کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے،اس لئے ڈرتے رہو کہ کہیں رسول کی نافرمانی کی صورت میں اللہ تعالیٰ تم پر کوئی سخت عذاب مسلط نہ کردے‘‘۔(تفسیر عثمانی:۵:۱۴۴)

رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (سورۃ النساء:۶۹)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

اپنی اور اپنے نبی کی اطاعت کو انبیاء اور صدیقین وغیرہ کی معیت کا سبب بتلاتے ہوئے فرمایا:

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ

تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے ،(یعنی) انبیاء، صدیقین،شہدا اور صالحین،اور ان لوگوں

وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا — کی رفاقت ہی اچھی رفاقت ہے، یہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ (سورۃ النساء:۶۹)

اور رسول کی اطاعت کو زبردست کامیابی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا — اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ (سورۃ الاحزاب:۷۱)

مطلب یہ ہے کہ حقیقی کامیابی کا راز اللہ ورسول کی اطاعت ہی میں ہے، جو اطاعت میں کامیاب ہوا وہ مقصدِ حیات پانے میں کامیاب ہوا۔

اتباع کے قابل سنتِ رسول ہی ہے اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا:

لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا — یقیناً تم لوگوں کے لئے رسول اللہ (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے جو اللہ کا سامنا کرنے اور آخرت کے دن کے برحق ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اور اللہ کا ذکر کرے۔ (سورۃ الاحزاب:۲۱)

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا اتباع ضروری ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ (تفسیر القرآن العظیم: ۳/ ۴۸۳)

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا:

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ — (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ (سورۃ آل عمران:۳۱)

یعنی آج اگر دنیا میں کسی شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو تو لازم ہے کہ اس کو اتباعِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص جس قدر محبوبِ خدا کی راہ چلتا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بناتا ہے اسی قدر سمجھنا چاہیئے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا ہے، جتنا اس دعوے میں سچّا ہوگا اتنا ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا، جس سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی مہربانیاں ملیں گی۔ (تفسیر عثمانی: ۱۲۰)

ایک جگہ اتباعِ رسول کو رحمتِ الٰہی کا وسیلہ بتلاتے ہوئے فرمایا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (سورۂ آل عمران: ۱۳۲)	اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، تم پر رحم کیا جائے گا۔

ایک جگہ اپنی وسیع رحمت کا حق دار اتباعِ رسول کرنے والوں کو قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ (سورۃ الاعراف: ۱۵۶)	اور میری رحمت ہر چیز پر غالب ہے میں اس رحمت کو ان لوگوں پر لازم کردوں گا جو شرک و کفر سے بچتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہمارے احکام پر ایمان لاتے ہیں اور رسول کی اتباع کرتے ہیں جو نبی اُمی ہیں۔

بعض اہل کتاب اللہ کی رحمتوں کی وسعتوں کی بات کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ بھی اس کے حق دار بن سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس فریب کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ یقیناً میری رحمت بہت وسیع ہے مگر اس کے حق دار بننے کے لئے ایمان اور اتباعِ رسول شرط ہے، اگر وہی نہیں تو پھر رحمتِ الٰہی کا استحقاق بھی نہیں۔

قرآن کریم کی یہ چند آیات بہ طور نمونہ پیش کی گئی ہیں حالاں کہ بے شمار آیات ہمیں

اتباع سنت کی اہمیت بتلاتی اور اس کا حکم دیتی ہیں، جہاں تک احادیثِ شریفہ کا تعلق ہے تو وہ بھی بہت ہیں ان میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادگرامی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری پوری امت جنت میں داخل ہوگی سوائے منھ پھیرنے والوں کے'' پوچھا گیا: منھ پھیرنے والوں سے کون مراد ہیں؟ فرمایا ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی وہی منھ پھیرنے والا ہے''۔ (بخاری: 7280) معلوم ہوا کہ اطاعتِ رسول امت پر لازم اور واجب ہے، اور جانتے بوجھتے اس کا انکار کرنا یا کسی کے توجہ دلانے پر منھ پھیر لینا بڑی ناقدری اور محرومی کی بات ہے، پھر اگر کوئی شخص اتباعِ سنت کو ضروری سمجھتا ہے مگر عمل نہیں کرتا وہ بھی اوّلی طور پر جنت میں داخل نہیں ہوسکتا، نبی کی نافرمانی کے سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جا سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ازواجِ مطہرات کے پاس تین آدمیوں نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادتوں کے بارے میں معلوم کیا، (چوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نفل عبادتیں گھر میں کرتے تھے اور ان کے بارے میں ازواجِ مطہرات ہی بتا سکتی تھیں) جب انھوں نے آپ کے معمولات کے بارے میں سُن لیا تو اسے اپنے اندازے سے کم محسوس کیا اور کہنے لگے اُن کا معاملہ الگ ہے، اُن کی اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت پہلے ہی ہو چکی ہے، کہاں وہ اور کہاں ہم گنہ گار! پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ پوری رات نوافل پڑھوں گا، دوسرے نے کہا میں پوری زندگی روزے رکھا کروں گا، تیسرے نے کہا میں بیویوں سے دور ہو جاؤں گا کبھی جماع نہ کروں گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس آئے اور اُن سے فرمایا: ''تم لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ یاد رکھو! بہ خدا میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں، لیکن میں کسی دن روزہ رکھتا ہوں اور کسی دن نہیں رکھتا ہوں، رات کے کسی حصے میں نمازیں پڑھتا ہوں اور کسی حصے میں سوتا ہوں اور بیویوں کے حقوقِ زوجیت بھی ادا کرتا ہوں، (یہ تو میرا طریقہ ہے اور تم نے ایسا ارادہ کیا ہے جو میرے طریقے کے خلاف ہے،) سنو! جو میرے طریقے سے روگردانی

کرے وہ مجھ سے نہیں''۔(بخاری:5063)اس واقعے میں اگر چہ صحابۂ کرامؓ کا جذبہ اُن کی فکرِ آخرت اور خوفِ خدا ہی کا اظہار کرتا ہے مگر وہ جذبہ خلافِ سنت تھا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جذبے کو رد کر دیا، معلوم ہوا کہ اچھے کام بھی سنت کے خلاف ہوں تو قبولیت کا مقام نہیں حاصل کر سکتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائیں''۔(شرح السنۃ:104) یعنی مومن کا جی کچھ بھی چاہتا ہو اور زمانے کا مطالبہ کچھ بھی ہو اس کو چاہیئے کہ ان سب سے اوپر اُٹھ کر دیکھے کہ نبی اور ان کا دین کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہ اُسے بہ حیثیت مسلمان صرف اپنے نبی ہی کی اتباع کرنی ہے، اسی سے اس کا ایمان کامل اور اس کا عمل معتبر ومقبول ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خاص خادم حضرت انسؓ کو یہ نصیحت کرتے ہوئے کہ''اگر تم سے ہو سکے تو ہمیشہ اپنے دل کو کینے سے پاک رکھو تو ایسا ہی کیا کرو'' اس نصیحت کے بعد یہ بھی فرمایا:''بیٹے! یہ میرا طریقہ ہے، اور جو میرے طریقوں سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے وہ جنت میں میرے ہی ساتھ ہوگا''۔(ترمذی:2678) معلوم ہوا کہ اتباعِ سنت سے نہ صرف یہ کہ نجات حاصل ہوتی ہے جنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت ومعیت بھی نصیب ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص بے دینی اور بے عملی کے دور میں میری سنت اور طریقے سے چمٹا رہے گا(یعنی سنت وشریعت کی پابندی کرے گا) اس کو سو شہیدوں کا ثواب دیا جائے گا''۔(مشکوٰۃ:176) یہ غیر معمولی اجر اتباعِ سنت کی اہمیت کو بتلا رہا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ''جو شخص پاکیزہ روزی کھائے، سنت پر چلے اور کسی کو تکلیف نہ دے وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا''۔(ترمذی:2520) سنت پر چلنے میں تمام چیزیں آگئیں، غور کریں تو اکلِ حلال اتباعِ سنت کا سبب ہے اور متبعِ سنت سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچ ہی نہیں سکتی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: میں تم لوگوں کے درمیان ایسی دو چیزیں چھوڑ دیا ہوں جن کو مضبوطی سے تھام لوگے تو کبھی گم راہ نہ ہوگے، ایک اللہ کی کتاب دوسرے اس کے نبی کا طریقۂ حیات‘‘۔

(مؤطا امام مالکؒ:03)

(ج)
صحابہ کرام کی اتباع بھی سنت ہے

نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی طرح صحابہ کرامؓ کی سنتیں بھی قابلِ اتباع ہیں، کیوں کہ صحابۂ کرام اگر چہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہیں لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کی ایسی کامل اور بے مثال اتباع کی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف کی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، اس لئے ہمارے لئے وہ لوگ نبی کے بعد اتباع کے لئے سب سے بہترین نمونہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معیار بناتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا یعنی اگر اہل کتاب ایسا ایمان لائیں جیسے تم لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پا جائیں گے، نیز قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ان کی خوبیوں اور سچی اتباع کا تذکرہ کیا جانا بھی اُن کے علم و عمل اور اخلاق کو دوسروں کے لئے حجت بنا دیتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے بھی ان کو دین میں حجت قرار دیا ہے، مثلاً ایک دفعہ آپ نے ایک درد انگیز خطبہ دیا، جس سے صحابہ کرامؓ کے قلوب کانپ اُٹھے اور آنکھیں بہہ پڑیں، اس موقع پر انہوں نے آپ سے کچھ خصوصی نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے سمع و طاعت کی وصیت کرنے کے بعد فرمایا ’’تم لوگ میرے بعد بہت اختلاف دیکھو گے، تم لوگوں پر میری اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنتوں کا اتباع لازم ہے، تم ان کو اختیار کرو اور ان پر مضبوطی سے جمے رہو‘‘۔ (ابوداؤد:4607) خلفائے راشدین کے علاوہ بھی آپ نے مختلف موقعوں پر مختلف صحابہ کرامؓ کے علم و عمل کی تعریف کرتے ہوئے

ان کے اتباع کی تلقین فرمائی ہے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نہایت وضاحت کے ساتھ اُمت کو اتباعِ صحابہؓ کی تاکید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''تم میں سے جو کوئی کسی کی راہ اپنانا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ جو لوگ گذر گئے ہیں ان کی راہ اپنائے، اس لئے کہ زندہ آدمی ابھی فتنوں سے مامون نہیں ہے، وہ (گذرے ہوئے) لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ ہیں، وہ لوگ اس امت کا سب سے افضل و برتر طبقہ ہیں، وہ لوگ دلوں کے نیک، علم میں پختہ، بناوٹ سے دور تھے، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنے نبی کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کی امامت کے لئے چُنا تھا، پس تم ان کے فضل و شرف اور مرتبے کو سمجھو اور ان کے نقشِ قدم کی اتباع کرو، جس قدر ممکن ہو انہی کے اخلاق و عادات اختیار کئے رہو، اس لئے کہ وہ لوگ ہی (یقینی طور پر) سیدھے راستے پر تھے''۔ (مشکوٰۃ:193)

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت میں تہتر فرقے ہوجانے کی پیشین گوئی کرتے ہوئے ان میں سب سے زیادہ نجات والا طبقہ ان کو قرار دیا جو آپ کے اور آپ کے اصحاب کے طریقے پر ثابت قدم ہوں''۔ جنھیں بعد میں اہل السنۃ والجماعۃ کا نام دیا گیا ہے۔ بہ ہر حال صحابہؓ کی اتباع بھی اتباعِ رسول میں داخل ہے۔ امام شاطبیؒ حضرت ابن مسعودؓ کی اس خاص تاکید کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مفہوم کے آثار بہت ہیں، ان کا مجموعہ دلالت کرتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی سنتوں کی اقتداء واتباع ہر حال میں لازم ہے، اور وہی نجات کا راستہ ہے۔ (الاعتصام: ۳/۳۰۷)

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ بعد میں آنے والوں سے علم وعمل، ایمان و عقل، دین وعبادت اور فہم جیسی تمام چیزوں میں سب سے برتر اور افضل ہیں اور یہ کہ دین کی ہر مشکل کا حل کرنے کے لئے وہی زیادہ حق دار ہیں، یہ وہ حقیقت ہے کہ اس کا سوائے اس شخص کے کوئی منکر نہیں ہے جسے اپنے علم پر غرور ہوگیا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کے علم ہی کے ذریعہ گم راہ کردیا ہو''۔ (مجموع الفتاویٰ: ۴/۱۵۷)

(د)

سنتوں کا اتباع نہ کرنے کے نقصانات

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت وشریعت عمل کے لئے دی گئی ہے اور اس پر عمل کو لازمی اور ضروری بتلایا گیا ہے تو اسی سے یہ بات ثابت اور واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی مخالفت کی کیا حیثیت ہے اور وہ کس قدر مُضر اور نقصان دہ حرکت ہوگی، اس جگہ خصوصیت کے ساتھ ان نقصانات کو بیان کرنے کی ضرورت تو نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چوں کہ انسانوں کے خیر خواہ ہیں اور انہیں ابدی خسارے سے بچانا چاہتے ہیں اس لئے اتباعِ شریعت وسنت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ اس کی خلاف ورزی کرنے کے نقصانات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، چناں چہ ایک جگہ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (سورۃ النور: ۶۳)

پس ڈرا دیجئے ان لوگوں کو جو اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس بات سے کہ وہ کسی آزمائش میں مبتلا کر دیئے جائیں گے یا اُنہیں دردناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امام ابن کثیرؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کی ان کے طریق کی ان کی سنتوں کی اور شریعت کی مخالفت کرتے ہیں انہیں بتلا دیا جائے کہ ان کے اقوال واعمال کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واعمال سے موازنہ کر کے دیکھا جائے گا، پس اگر اس کے موافق ہوں گے تو قبول کئے جائیں گے اور اگر اس کے خلاف ہوں گے تو اُمت کے وہ اقوال واعمال انہی پر رد کر دیئے جائیں گے، خواہ کوئی بھی ہوں۔

(تفسیر القرآن العظیم: ۳/ ۳۱۸)

ایک جگہ نافرمانی کا انجام جہنم ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ (سورۃ النساء:۱۴)

اور جو کوئی اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے تجاوز کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل کرے گا اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

یعنی اگر اللہ ورسول کے احکام سے کفر کی حد تک خلاف ورزی کرے گا تو ہمیشہ ہی کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا ورنہ ہمیشہ کے لئے نہ سہی جہنم میں جانا تو پڑے گا، وہ بھی بڑی محرومی اور رسوائی کی بات ہے۔

ایک اور جگہ نافرمانی کو کفر بتاتے ہوئے سخت تنبیہ کی ہے:

قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ (سورۃ آل عمران:۳۲)

آپ کہہ دیجئے کہ لوگو! اللہ ورسول کی اطاعت کرو، اور اگر روگردانی کروگے تو (یادرکھو) اللہ تعالیٰ کافروں (نافرمانوں) کو پسند نہیں فرماتا۔

یہ اور ان جیسی بے شمار آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والوں کو سخت تنبیہ کرتی اور دنیا وآخرت کے نقصان سے ڈراتی ہیں۔

جہاں تک احادیثِ شریفہ کا تعلق ہے تو چند حدیثیں بھی ملاحظہ کرلیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”جو کوئی ہمارے دین میں اپنی طرف سے مزید باتیں داخل کرے (یاردوبدل کرے) تو وہ مردود ہیں“ (بخاری:2697) یعنی سنت وشریعت کے خلاف ہر بات ناقابلِ قبول اور مردود ہے، صرف اللہ ورسول کے احکام اور ان کا بتایا ہوا دین ہی دینِ اسلام ہے، اس کے علاوہ سب بے کار ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”یقیناً سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے اچھا طریقۂ حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے، اور سب سے بری بات بدعت ہے یعنی دین میں اپنی

طرف سے اضافہ ہےاور ہر بدعت گمراہی ہے''۔(مسلم:867)

ایک حدیث میں ہے کہ'' جو میرے طریقہ سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں''۔ (بخاری:5063) یعنی ایسا آدمی میرے فرماں برداروں میں سے نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کو جائز قرار دیا، بعض لوگ پھر بھی احتیاطاً اس کام سے پرہیز کررہے تھے، آپ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں ان لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا ''بعض لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ اس کام سے احتیاط برتتے ہیں جسے میں نے کیا ہے، خدا کی قسم! میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے اور اس سے ڈرنے والا ہوں''۔(بخاری:6101)

معلوم ہوا کہ کسی مسئلے میں بھی رسول کی مخالفت درست نہیں ہے، تقویٰ بھی وہی معتبر ہے جو نبی کے تقویٰ کے مطابق ہو، ورنہ ایسا تقویٰ مردود ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ'' میری اور اس دین کی مثال جس کے ساتھ مجھے مبعوث کیا گیا ہے ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے اپنی قوم کے پاس آکر کہا کہ میں نے دشمن کے لشکر کو آتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میں تم لوگوں کو کھلے طور پر ڈرارہا ہوں کہ اس کے پہنچنے سے قبل اپنی حفاظت کا انتظام کرلو، یہ سُن کر لوگ تصدیق واطاعت کا معاملہ کرتے ہوئے صبح سویرے سے قبل ہی اس جگہ سے کوچ کر کے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ گئے اور دشمن کے حملے سے بچ گئے، اور کچھ لوگوں نے اس خیر خواہ کو جھٹلاتے ہوئے وہیں قیام کیا، لشکر صبح سویرے اچانک آدھمکا ،ان سب کو ہلاک و برباد کردیا، بس یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو میری بات مانتے اور اتباع کرتے ہیں اور جو مجھے جھٹلا کر نافرمانی میں مبتلا رہتے ہیں''۔(مسند احمد:7283)

معلوم ہوا کہ رسول کی اتباع نہ کرنے والے کسی وقت بھی عذابِ الٰہی کا شکار اور نامراد ہوسکتے ہیں، اللہ بچائے۔آمین

ایک حدیث میں ہے کہ'' آخری زمانے میں کچھ جھوٹے اور مکار لوگ ہوں گے جو بہ جائے بڑوں کے ذریعے تواتر سے چلی آئی میری تعلیمات پر عمل کرنے کے اپنی طرف سے

ایسی ایسی باتیں تمہارے سامنے بیان کریں گے جنہیں تم اور تمہارے آباء واجداد یعنی علماءِ سلف وخلف نے کبھی نہیں سنا ہوگا، پس تم ایسے لوگوں سے دور رہو اور ان کو اپنے سے دور رکھو، کہیں وہ تم کو راہ سے بھٹکا کر کسی فتنے میں مبتلا نہ کردیں‘‘ (مسلم فی المقدمہ:07)

یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہ جائے خود ایک معجزہ ہے، آج کُھلی آنکھوں اس کے ایک ایک لفظ کا مشاہدہ ہو رہا ہے، زبان وقلم کے کھلواڑوں کی ایک بڑی تعداد پورے عالم میں ظاہر ہوگئی ہے جن کو سلف سے چلے آئے متوارث ومتواتر احکامِ دین پر اعتماد نہیں ہے اور اپنی تمام تر علمی وعملی کوتاہیوں کے باوجود بڑی مکاری اور پوری ڈھٹائی سے دین کی نئی نئی تشریحات وتعریفات پھیلا رہے ہیں، اور لوگ بہت آسانی کے ساتھ گم راہ ہوتے جا رہے ہیں ؛ یادرکھئے نجات اتباعِ شریعت وسنت کے علاوہ کسی چیز میں نہیں اور شریعت وسنت وہی ہے جسے سلف نے تسلیم کیا ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ ’’جب بھی کوئی قوم کسی بدعت میں مبتلا ہوتی ہے تو اسی کے مثل ایک سنت اُٹھالی جاتی ہے، (دارمی کی ایک اور روایت میں ہے کہ پھر قیامت تک وہ سنت واپس نہیں آتی) پس سنتوں پر عمل بدعات میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے‘‘۔ (مسند احمد:16970)

اِن تمام آیات واحادیث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ راہِ خدا میں ترقی کرنا چاہنے والوں اور آخرت میں نجات کے خواہش مندوں کو چاہئے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وسنت کا اتباع اپنے لئے لازم کرلیں، علماء سے جڑے رہیں اور ہر کام کا مسنون طریقہ معلوم کرکے اس کے مطابق زندگی گذارتے رہیں، یہی حقیقی وسیلہ ہے اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کا۔

حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اتباع سنت وشریعت کی توفیق نصیب فرمائے۔

۹

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

اچھی باتوں کا حکم دینا اور بُری باتوں سے روکنا

(الف)

امر بالمعروف نہی عن المنکر کی تعریف وضرورت

امر کسی کام کا حکم دینے کو کہتے ہیں اور معروف اچھی باتوں کو کہتے ہیں، امر بالمعروف کے معنیٰ ہیں اچھی باتوں کا حکم دینا اور انہیں پھیلانا۔ نہی منع کرنے اور روکنے کو کہتے ہیں منکر اجنبی، ناپسندیدہ اور بُری باتوں کو کہتے ہیں، نہی عن المنکر کے معنی ہوئے بری باتوں سے روکنا۔ جب ان الفاظ کے علاحدہ علاحدہ معانی معلوم ہو گئے تو اب جاننا چاہیئے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اچھے کاموں کا پابند کیا ہے اور بُری باتوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے، اسلام کسی بری بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا اچھائیاں، برائیاں ہر شعبے میں پائی جاتی ہیں جیسے عقیدے میں توحید اچھی بات ہے، شرک بُری بات ہے، عبادات میں جیسے نماز اچھی بات ہے اور اس سے غفلت کرنا بُری بات ہے، معاملات میں جیسے رعایت واحسان اچھی چیز ہے اور سود اور خیانت بُری چیز ہے، معاشرت میں راحت رسانی اچھی بات ہے اور ایذا دینا بہت بُری بات ہے، اخلاق میں ایثار اچھی بات ہے اور خودغرضی بُری صفت ہے، غرض یہ کہ پوری زندگی میں خواہ اقوال ہوں یا افعال، معروفات ومنکرات یعنی اچھائیاں اور بُرائیاں بھری پڑی ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اچھائی اور بُرائی کا

معیار اگرچہ کہ بہت حد تک عقل بھی ہے لیکن بہ حیثیتِ مسلمان ہمیں اس سلسلے میں شریعت ہی کو معیار بنانا ہوگا یعنی کسی بات کو شریعت اچھی کہتی ہے یا بُرا قرار دیتی ہے تو اگر غور کیا جائے تو عقل کے نزدیک بھی ایسا ہی ہوگا تاہم اگر کبھی عقل کو اس کا اچھا ہونا یا بُرا ہونا تسلیم نہ ہو یا عرف و عادت میں اس کے برخلاف سمجھا جاتا ہو تو ہم اس کے باوجود وہی کہیں گے جو شرع نے کہا ہے، کیوں کہ شریعت کے احکام عقل کے عین مطابق ہوا کرتے ہیں لیکن کبھی عقل فیصلہ کرنے میں غلطی کرتی ہے، جس کا ہمیں زندگی میں بار بار تجربہ ہوتا رہتا ہے، اور شریعت کے احکام چوں کہ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اس لئے ان میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔

اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک تعریف اس طرح کی گئی ہے:

امر بالمعروف: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے جن اقوال و افعال سے راضی ہوتا ہے ان اقوال و افعال کی جانب بندوں کو متوجہ کرنے کا نام ہے اور نہی عن المنکر: شریعت اور عفت جس چیز سے نفرت کرتی ہے اُن کی قباحت بیان کرنے کا نام ہے، اور یہ وہی چیزیں ہیں جنہیں شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ (التعریفات: ۳۷)

اس کے بعد جی چاہتا ہے کہ مفکرین اسلام میں سے امام غزالیؒ اور محدثین کرام میں سے امام نوویؒ کی دو فکر انگیز و عبرت خیز تحریریں بھی ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر دی جائیں، تاکہ اس فریضۂ واجبہ کی ادائیگی کے لئے کھڑے ہونے میں مدد مل سکے۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اپنی مشہور و بافیض کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں فرماتے ہیں:

''امر بالمعروف نہی عن المنکر'' دین اسلام کا قطب اعظم ہے اور یہی وہ اہم فریضہ ہے جس کے لئے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی ہے، جب اس فریضے سے غفلت برتی جاتی اور اس کی تعمیل میں سستی و لاپرواہی عام ہو جاتی ہے تو جہالت و فساد غالب ہو جاتا ہے، بے دینی و گمراہی پھیل جاتی ہے، آبادیاں ویران اور انسانیت ہلاک ہو جاتی ہے، مزید برآں مصیبت یہ ہے کہ اس ہلاکت و بربادی کا پتہ بھی قیامت سے پہلے نہیں چل پاتا۔ اس قدر

اہم اور سنگین مسئلہ ہونے کے باوجود اس وقت امت کی صورت حال یہ ہے کہ امت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے بالکلیہ غافل ہوکر اسے ترک کردیا ہے، چنانچہ اس فریضے سے اعراض اور لاپرواہی کا جو خطرہ اور اس کے جو نقصانات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں سب آنکھوں کے سامنے عملاً رونما ہو گئے ہیں، **انا للہ وانا الیہ راجعون**، خلاصہ یہ ہے کہ آج کل دین کے اس عظیم فریضے اور اسلام کے قطب اعظم سے علماً وعملاً تغافل بڑھتا جارہا ہے، اس کی حقیقت تو کیا باقی رہتی رسم تک مٹتی جارہی ہے، خدام دین کے دلوں پر مخلوق کی مداہنت ومروت چھائی ہوئی ہے، خالق کے حقوق کا استحضار ختم ہوگیا ہے، لوگ جانوروں کی طرح ہوس کی تکمیل میں مست ومگن ہو گئے ہیں، اور روئے زمین پر اللہ کے ایسے باغیرت بندے ملنے مشکل ہو گئے ہیں جو کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر حق کا احقاق اور باطل کا ابطال کرتے ہوں، اور اس فریضے کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خوف ان پر طاری نہ ہو، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اگر کوئی اللہ کا غیرت مند بندہ اس نقصان کی تلافی اور اس فریضے کی بحالی کے لئے کمر ہمت کس لے اور اس سکوت وجمود، مداہنت و غفلت کی مہر توڑ کر امر بالمعروف نہی عن المنکر کی سنت کو رواج عام دینے میں مشغول ہوجائے تو وہ شخص یقیناً ایک ''مردہ سنت'' کو زندہ کرنے کے ثواب اور قرب الٰہی کے درجاتِ عالیہ کا مستحق ہوگا۔ (احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۰۲)

یہ تھے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، جو دین اسلام میں امر بالمعروف نہی عن المنکر کی اہمیت وضرورت کا تذکرہ اور ان کے زمانے میں عام طور سے اس سلسلہ میں جو غفلت برتی جارہی تھی اس کا شکوہ فرمارہے تھے اور بڑی ہی لجاجت ودرد کے ساتھ اس فریضے کو پھر سے رواج دینے کی دعوت اور کسی مرد مجاہد کے اٹھ کھڑے ہونے کی تمنا ظاہر فرمارہے تھے، آیئے! اس کے بعد اب ہم عالم اسلام کے ایک اور عظیم المرتبت امام محدثِ عظیم، شارح صحیح مسلم، حضرت امام نوویؒ کی زبانی اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں، وہ ارشاد نبوی ''من رأی منکم منکرا الخ'' کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

معلوم ہونا چاہئے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ ایک عرصے سے مسلمانوں کے تغافل کا شکار ہے، اس زمانے میں تو بس اس کی بعض ظاہری شکلوں اور چند رسوم کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہا، جب کہ یہ کام دین اسلام کا ایسا شعبہ ہے کہ اسی پر اس کی بقاء وارتقاء موقوف ہے، کیوں کہ جب منکرات کا شیوع ہوجاتا ہے اور لوگ اس کے روکنے کی کوشش بھی نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ نیک وبد سبھی کو گھیر لیتی ہے اور عذاب الٰہی پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ''یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت ونافرمانی کی جرأت کررہے ہیں، اس بات سے ڈرادیجئے کہ یا تو وہ کسی آزمائش میں مبتلا کردئے جائیں گے یا پھر عذاب الٰہی کے شکار ہوجائیں گے، اس لئے آخرت کے طلب گاروں اور رضائے الٰہی کے خواہش مندوں کو چاہئے کہ دین کے اس عظیم شعبے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اس کے تقاضوں پر عمل کرتے رہیں، کیونکہ اس کے فوائد بہت ہیں، بالخصوص ایسے دور میں جب کہ اس حکم کا بڑا حصہ ضائع اور اس کی طرف سے لاپرواہی عام ہوتی جارہی ہے۔

یہ بھی یادرہے کہ اس کام کے سلسلے میں کسی صاحبِ مرتبہ کے مرتبے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے (دین کی) مدد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد فرماتا ہے اور ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے لئے راستے کھول دیتے ہیں، ایسے مواقع پر یہ بات یادرکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندے کا اجر اس کی راہ میں اٹھائی جانے والی اس کی محنت ومشقت کے حساب سے ہوتا ہے، اسی طرح امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرنے میں دوستوں، محبتوں، شفقتوں اور اغراض وتعلقات کو بھی رکاوٹ نہ بننے دینا چاہئے، کیوں کہ دوستی وتعلق کے بھی کچھ تقاضے اور حقوق ہوتے ہیں، ان حقوق میں سے یہ بھی ایک حق ہے کہ آدمی اپنے عزیزوں اور دوستوں

کی آخرت کا خیرخواہ اور وہاں کے نقصانات سے بچانے والا ہو، بل کہ آدمی کا سچا دوست اور حقیقی ہم درد اصل میں وہی ہے جو اس کی آخرت کے بنانے میں مدد کرے، خواہ اس کی وجہ سے بظاہر دنیا کا کچھ نقصان ہی ہو رہا ہو، اس کے برخلاف آدمی کا حقیقی دشمن وہ ہے جو اس کی آخرت برباد کرتا ہو اگر چہ اس کے ذریعہ دنیا کا کوئی فائدہ بھی ہوتا ہوا نظر آ رہا ہو، دیکھئے! ابلیس ہمارا دشمن اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہماری آخرت اجاڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اس کے برخلاف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمارے اور تمام مسلمانوں کے دوست ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ ہماری آخرت کے بنانے والے ہیں، بہ ہر حال اخروی نجات وکامیابی کی کوششوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور نقصان وخسران سے بچاتے رہنا ہی سچی محبت و مودت اور مخلصانہ دوستی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہمارے احباب کو اور تمام مسلمانوں کو اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق نصیب فرمائے، اور ہم سب پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائے آمین۔ (مسلم: بشرح النووی کتاب الایمان)

ایک اور قدیم مصلح رکن الاسلام سمرقندیؒ فرماتے ہیں: جو شخص لوگوں سے ملتا جلتا رہتا ہے یعنی اجتماعی زندگی گذارتا ہے اس کے ذمّے سب سے بڑا واجب امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے، یعنی لوگوں کو نیکی کے کاموں کی ترغیب دینا اور برائی کے کاموں سے روکنا، حقیقت یہ ہے کسی آدمی کو اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کو دیکھ کر کسی قسم کی خفگی وناراضگی نہیں ہوتی تو اس کا کوئی عمل اس کو نفع نہیں دیتا، چناں چہ احادیث کی صراحت کے مطابق لوگ اس وقت ہلاک وبرباد ہو جاتے ہیں جب امر بالمعروف نہی عن المنکر ترک کر دیتے ہیں، ایسے وقت ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے، ان کی دعائیں نامقبول ہو جاتی ہیں، اور وہ خیر وبرکت اور مقاصد میں کامیابی سے محروم ہو جاتے ہیں، بالخصوص جب کہ منکرات علی الاعلان ہو رہے ہوں۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ کسی منکر کو دیکھتے اور کسی وجہ سے اس پر نکیر نہ فرما سکتے تو ان کے اوپر اس کا اس قدر اثر ہوتا تھا کہ کئی دن تک پیشاب میں خون آنے لگتا تھا، اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ منکرات کی روک تھام کے لئے محض

دینی حمیت اور اسلامی غیرت کے جذبے کے ساتھ کھڑا ہو کر اس فریضے کو ادا کرے، لوگوں کی چاپلوسی اور مداہنت کو اس راہ میں ہرگز حائل ہونے نہ دے۔ (شرعۃ الاسلام: ۳۶۴)

(ب)
امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فضائل وفوائد

ارشاد ربانی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (سورۂ آل عمران: ۱۱۰)

تم ایک بہترین امت ہو، جو لوگوں کی نفع رسانی کے لئے برپا کی گئی ہو (تمہاری خصوصیت یہ ہے کہ) تم اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

دیکھئے! آیت شریفہ میں سماج کی صلاح و بہبود کا تمام مسلمانوں کو ذمہ دار بتلایا گیا ہے، بلکہ اس امت کی امتیازی خصوصیت یعنی خیر امت ہونے کی شرط ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ اور زجاجؒ کا قول ہے، جب کہ اس قول کی تائید حضرت عمر بن خطابؓ کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: جو شخص اس فضیلت کا مستحق بننا چاہتا ہے جو اس آیت میں مذکور ہے تو اسے چاہئے کہ اس کی شرط کو پورا کرے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔
(زادالمسیر: ۱۹۱)

امام ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں امت محمدیہ کے فضائل اور خیر امت ہونے کے دلائل پر مشتمل متعدد روایات درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ تمام احادیث مبارکہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی وضاحت کرتی ہیں اور یہ بتلاتی ہیں کہ جو شخص ان

صفات سے متصف ہوگا وہی اس فضیلت کا مستحق ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''جو شخص خیر امت ہونے کی فضیلت میں شامل ہونا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ ان شرائط کو پورا کرے جو آیت شریفہ میں بیان کی گئی ہیں'' یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اہتمام کرتا رہے۔ (تفسیر القرآن العظیم: ۱/۴۷۴ ۳)

مفسرِ قرآن کلبیؒ فرماتے ہیں:

یہ آیت دیگر امتوں پر امتِ محمدیہ کی فضیلت کو ظاہر کرتی ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ امت تمام امتوں سے مطلقاً بہتر و برتر ہے، یہ بھی واضح رہے کہ خیریت کی یہ فضیلت اس امت کے تمام افراد کے لئے ہے، خواہ وہ اگلے لوگ ہوں یا پچھلے، یہ اور بات ہے کہ اس خیریت کے مراتب میں کمی زیادتی ہوسکتی ہے، جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بزرگی کو کوئی دوسرا شخص نہیں پاسکتا، پھر یہ خیریت وفضیلت اسی وقت تک ہے جب تک کہ امت امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فریضہ پر قائم اور اس صفت سے متصف بھی ہو، چنانچہ جو لوگ اس فریضے کو ترک کر دیتے ہیں تو یہ فضیلت ان سے زائل ہوجاتی ہے۔

(مکاشفۃ القلوب: ۷۰)

اس آیت سے کچھ ہی پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے تاکیدی ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴ (سورۃ اٰل عمران: ۱۰۴)	تم میں ایک جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر اور بھلائی (اسلام اور اطاعت خداوندی) کی طرف بلائے اور اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: آیت میں خیر کی طرف دعوت سے مراد بعض کے نزدیک اسلام کی طرف دعوت ہے اور بعض دوسروں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف دعوت

ہے، ''معروف'' نیک اور بھلے کام کو کہتے ہیں اور ''منکر'' برے اور عقل وشرع کے نزدیک ناپسندیدہ حرکت کو کہتے ہیں۔

زجاجؒ فرماتے ہیں آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم سب کے سب دعوت الی الخیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرتے رہو، کیونکہ مِنۡ یہاں تبعیض کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ جس طرح فَاجۡتَنِبُوۡا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ کے معنی ''بتوں میں سے جو گندے ہیں ان سے بچو'' نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا صحیح مطلب ''تمام بتوں سے بچو کیوں کہ وہ سب گندے اور ناپاک ہیں'' ہوتا ہے، (اسی طرح وَلۡتَكُنۡ مِنۡكُمۡ اُمَّةٌ کا ترجمہ ''تم سب امتیوں کا وصف یہ ہونا چاہیے'' ہوگا) البتہ یہ ترجمہ بھی درست ہوسکتا ہے کہ تم لوگوں میں ایک جماعت مستقل اسی کام کے لئے بھی ہونی چاہئے۔ (زادالمسیر: ۱۸۸)

حاصل کلام یہ نکلا کہ یہ کام بہ حیثیت مجموعی اگرچہ تمام مسلمانوں پر اپنی استطاعت اور صلاحیت کے بقدر واجب ہے، مگر اس کے ساتھ ایک جماعت کا مستقل طور پر اس کام کے لئے مختص وموجود ہونا بھی اسلامی سماج کے برائیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے، تاکہ وہ جماعت دین کے تمام شعبوں پر نظر رکھتے ہوئے تفصیل واہتمام کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو بجالاتی رہے اور اس فریضے کا وہ حصہ جو عامۃ المسلمین کی قدرت وعمل سے باہر ہے اس کی تکمیل کرتی رہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں دعوت الی الخیر سے مراد کتاب وسنت کے اتباع کی دعوت ہے، جیسا کہ ابن مردویہؒ سے منقول ہے اور آیت شریفہ کا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ ہے مگر ساتھ ہی ایک جماعت کا مستقل اسی کام کے لئے ہونا بھی ضروری ہے جو پوری ذمہ داری کے ساتھ احکام اسلامی کے مطابق انسداد فواحش ومنکرات کا کام کرتی رہے۔ (تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۳۶۸ ملخصاً)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: اس سے قبل کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ''تکمیل نفس''، یعنی اپنی ذات کی ہدایت واصلاح کا حکم دیا تھا، اب اس کے بعد ''تکمیل غیر''، یعنی سماج

کی ہدایت واصلاح کی ذمہ داری دے رہے ہیں، تاکہ مسلمان ہدایت یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت دہندہ بھی بن جائیں، جس طرح منکرین اسلام خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ نیز ''دعوت الی الخیر'' کے بعد امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر ''عطف الخاص علی العام'' کے قبیل سے ہے اوراس کا منشاء دیگر خیرات وحسنات میں اس کی اہمیت وافضلیت کو اجاگر کرنا ہے، علماء کا اس پر اجماع ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ''فرض کفایہ'' ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ''فرض کفایہ'' آیا تمام مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے، یا بعض کے ادا کرنے سے دوسروں کے ذمے سے بھی ساقط ہوجاتا ہے، یا صرف بعض کے ذمہ واجب ہوتا ہے؟ جمہور علماء کے نزدیک پہلی بات زیادہ صحیح ہے کہ اصلاً تمام آحاد وافراد امت پر واجب ہوتا ہے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی بھی اس فریضہ کو ادا نہ کرے تو سب گناہ گار ہوتے ہیں، اگر سب پر فرض نہ ہوتا تو ترک کی صورت میں سب گناہ گار کیوں ہوتے؟ اسی لئے جمہور علماء ولتکن منکم میں ''مِنۡ'' کو ''تبیین'' کے لئے مانتے ہیں ''تبعیض'' کے لئے نہیں۔ (روح المعانی: ۲/ ۱۰۳ ملخصاً)

شاہ عبد القادرؒ صاحب فرماتے ہیں اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں فرض ہے ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کو اور دین کی باتوں کے مقید رکھنے کو تاکہ دین کے خلاف کوئی نہ کرے اور جو اس کام پر قائم رہے کامیاب ہیں اور یہ طریقہ کہ کوئی کسی سے تعرض نہ کرے اور یوں خیال کرے کہ ''موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود'' (یعنی جس کو جو کرنا ہے کرے ہمیں کیا؟) یہ راہ مسلمانی کی نہیں۔ (معارفِ ادریسی: ۲/ ۳۰)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کی باہمی مودت اور دوستی اور اس دوستی کا حق ادا کرتے رہنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُقِيۡمُوۡنَ	مومن مرد، مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں، بری باتوں سے روکتے ہیں

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱
(سورۃ التوبہ:۷۱)

نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ عنقریب رحم فرمانے والا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔

اسی سورہ میں منافقین کا حال بالکل اس کے برعکس بیان کیا گیا ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۶۷
(سورۃ التوبہ:۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ ایک دوسرے کو بری باتوں کا حکم دیتے ہیں، بھلی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (خیر خیرات سے) روکے رکھتے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں بھلا دیا ہے، یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں۔

ان آیات میں مومنوں اور منافقوں کی خصوصی علامتوں کو واضح طور پر بیان کر کے اس کے ذریعہ اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ سماج میں اچھی باتیں پھیلانا اور بری باتوں سے امت کو روکتے رہنا تقاضۂ ایمان ہے، اس کے برخلاف بری باتوں کو پھیلانا اور اچھی باتوں سے لوگوں کو روکتے رہنا بدنصیب منافقوں کا کام ہے۔

ایک اور جگہ بنی اسرائیل کے منافقوں کی بدحالی بیان فرما کر اس کی وجہ ان کے علماء کی جانب سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت کو قرار دیا اور ان کے علماء کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے، ملاحظہ ہوں:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۲ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۶۳ (سورۃ المائدہ: ۶۲، ۶۳)

اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ گناہوں، ظلم کے کاموں اور حرام خوری میں آگے نکل گئے تھے، یہ ان کی بہت بری حرکت تھی، ان کے علماء ومشائخ نے گناہ کی باتوں اور حرام خوری سے انہیں کیوں نہیں روکا؟ یہ ان کی بدترین حرکت تھی۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں حضرت علیؓ کا ایک خطبہ نقل فرمایا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف کے بعد فرمایا: لوگو! تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت ان کے عوام کی گناہوں پر جرأت اور علماء وصلحاء کی طرف سے نکیر واصلاح میں کوتاہی کی وجہ سے ہوئی تھی، جب یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب میں گرفتار کئے گئے، پس تم لوگ امر بالمعروف نہی عن المنکر کرتے رہو قبل اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر کوئی عذاب نازل ہوجائے اور جان رکھو کہ اچھی باتوں کا حکم دیتے رہنے اور بری باتوں سے لوگوں کو روکتے رہنے کا کام نہ تمہاری روزی کو گھٹائے گا اور نہ عمر میں کمی کرے گا، یعنی بےخوف وخطر اس ذمہ داری کو نباہتے رہو۔

اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل فرمایا کہ پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کسی اور آیت میں نہیں ہے اور ضحاکؒ کا قول نقل کیا ہے میرے علم میں پورے قرآن میں اس سے زیادہ خوفناک آیت کوئی اور نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/۷۱)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہوجاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں، بنی اسرائیل کا حال یہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات وشہوات میں منہمک ہوکر خدا کی عظمت وجلال کو اور اس کے

قوانین واحکام کو بھلا بیٹھے اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا، کیونکہ دنیا کی حرص اور اتباعِ شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے، مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہو جاتا تھا، اسی سکوت اور رہبانیت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں، اسی لئے امتِ محمدیہ کو بے شمار نصوص میں بہت ہی سخت تاکید کی گئی ہے کہ کسی وقت بھی اور کسی شخص کے مقابلے میں بھی اس فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔

یہ صرف پانچ آیات اور ان کی تفسیر ہے ورنہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے سلسلے میں قرآن کریم میں تیرہ آیتیں تو انہی الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی ہیں اور جو آیات تذکیر وتبلیغ، نصیحت وموعظت، ارشاد وانذار، دعوت وہدایت، جیسے الفاظ وتعبیرات کے ذریعہ اس فریضہ کی جانب مخاطبین قرآن کو متوجہ ومتنبہ کرتی ہیں وہ بے شمار ہیں۔

آیات قرآنیہ کے بعد اب چند احادیثِ نبویہ کو بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو، اس سے پہلے پہلے کہ (برائیوں کے شیوع سے ایسا وقت آجائے) کہ تم دعائیں مانگو تو قبول نہ کی جاویں۔ (ابن ماجہ:4004)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اہتمام سے کرتے رہو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اپنی جانب سے عذاب نازل فرما دیں گے، پھر اس کے بعد تمہاری دعائیں تک قبول نہ ہوں گی۔ (ترمذی:2169)

اسی طرح ''سنن ابوداؤد'' میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ بنی اسرائیل کی تباہی کی وجہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''بنی اسرائیل میں جو زوال آیا اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک آدمی کسی کو برائی کا کام کرتا ہوا دیکھتا تھا تو اس کو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس معصیت سے باز آجانے کی تلقین

کرتا تھا، لیکن جب اگلے روز اس سے ملاقات ہوتی تو اس معصیت کو ترک نہ کرنے کے باوجود بھی اس کے ساتھ بیٹھنے اور کھانے، پینے، یعنی دوستانہ تعلقات رکھنے سے اجتناب نہیں کرتا تھا، جب لوگوں کے ایسے حالات ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب ایک دوسرے سے خلط ملط کر دئے"، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور استشہاد قرآن کریم کی درج ذیل آیات کی تلاوت فرمائی۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۝۷۸ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝۷۹

(سورۃ المائدہ:۷۸،۷۹)

بنی اسرائیل کے نافرمانوں پر حضرت داوٗد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی زبانوں سے لعنت کی گئی، یہ اس لئے کہ انہوں نے ان بری باتوں کا ارتکاب کیا تھا جن سے انہیں روکا گیا تھا، وہ لوگ ایک دوسرے کو برے کاموں کے ارتکاب سے روکا نہیں کرتے تھے یہ بہت بری حرکت تھی جو وہ لوگ کیا کرتے تھے۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو ان لوگوں کی اس حرکت اور اس کے اثرات بد سے خبردار کرتے ہوئے سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔

"خبردار! تم لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اہتمام سے ادا کرتے رہو اور ظالم کو ظلم سے باز رکھتے رہو اور اس کو حق کی جانب مائل کرتے رہو اور حق کی طرف پھیرتے رہو۔" (ابوداؤد 4336)

ایک دوسری روایت کے مطابق اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دے گا پھر تمہارے اوپر اسی طرح لعنت کی جائے گی جس طرح ان لوگوں پر کی گئی تھی۔" (ابوداؤد:4337)

نیز ایک اور حدیث میں یہ تنبیہ اس طرح ہے: حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس قوم کے اندر گناہوں کی کثرت ہو جائے اور وہ قوم اس کی اصلاح پر قدرت رکھنے کے باوجود ان کی اصلاح نہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان پر عمومی عذاب نازل فرما دیتے ہیں۔(ابوداؤد:4338)

علامہ عبدالرؤف مناویؒ اسی قسم کی ایک روایت کی تشریح میں فرماتے ہیں: بخدا! دنیا میں دو میں سے ایک بات کا موجود ہونا ضروری ہے یا تو تمہاری طرف سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضۂ عادلہ موجود رہے گا یا اگر وہ نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب عظیم آموجود ہوگا، پھر معلوم ہونا چاہیئے کہ دعاؤں کا قبول ہونا، نظام زندگی کا بہتر رہنا اور نبی کی شریعت کا قائم ودائم رہنا یہ سب امور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیاد مستحکم ہونے پر موقوف ہیں، اس لئے ہر مسلمان کے ذمّے ''امر ونہی'' کا فریضہ ادا کرتے رہنا لازم ہے، یہاں تک کہ اس شخص کے لئے بھی جو خود اس جیسے منکر میں مبتلا ہے، حدیث مذکور میں معاصی پر نکیر وتذکیر کے ضروری ہونے کا انکار کرنے والے کو تنبیہ کی گئی اور ڈرایا گیا ہے کہ ایسے شخص کا عذاب دفع نہ ہوگا اور دعائیں قبول نہ ہوں گی، یہ سخت ترین وعید ہے جب کہ ایک عقل مند کو اس سے بہت کم تنبیہ بھی کافی ہو جانی چاہیئے۔(فیض القدیر:۵/۳۱۵)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ (یا اثر ورسوخ) سے بدل (کر درست کر) دے، پس اگر وہ (کسی وجہ سے) ایسا نہ کر سکے تو زبان سے نکیر کر دے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو (کم از کم) اپنے دل سے اس منکر کو برا سمجھے اور (یہ آخری صورت) سب سے کمزور ایمان ہے۔(مسلم:78)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''فلیغیرہ'' امر کا صیغہ ہے اور باجماع امت یہ حکم واجب ہے، اس لئے کہ قدرت ہونے کی صورت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کتاب وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں واجب ہے، کیونکہ یہ کام دراصل مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی وہمدردی ہے جب کہ مسلمانوں کی نصیحت وخیر خواہی ہی ''اصل دین'' ہے، جیسا کہ حدیث ''الدین النصیحۃ'' سے معلوم ہوتا ہے، چناں چہ امر ونہی کے واجب ہونے کا

انکار سوائے بعض روافض کے امت میں کسی اور نے نہیں کیا، روافض کا انکار کرنا کسی مسئلے کے ثبوت میں کچھ بھی مضر نہیں ہے، کیونکہ اس کے واجب ہونے پر امت کا اجماع اس وقت منعقد ہو چکا تھا جب کہ ان لوگوں کا ظہور بھی نہیں ہوا تھا، جہاں تک ارشاد ربانی ''عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ'' کا تعلق ہے تو (وہ بھی اس کام کے وجوب کے منافی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ) علماء محققین اور مفسرین کی صراحت کے مطابق اس کا مطلب یہی ہے کہ جب تم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اپنا فریضہ ادا کر دیا تو اب اس کے باوجود ان کے بھٹکنے اور گمراہ ہوجانے کا وبال تم پر کچھ نہ ہوگا، یعنی جب تم نے نکیر کردی تو تمہاری ذمہ داری پوری ہوگئی، خواہ وہ قبول کر کے عمل کرے یا نہ کرے، اس لئے کہ تمہاری ذمہ داری صرف امر و نہی کی تھی نہ کہ قبول کروانے کی، خلاصۂ بحث یہ ہے کہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ امر و نہی ہی ترک کردی جائے، جب کہ ارشاد ربانی ہے : ان عليك الا البلاغ۔(مسلم شرح النووی: ۲/۲۱۸)

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث شریف کی تشریح میں بعض علماء نے فرمایا کہ یہ درجاتِ ایمان کی تقسیم ہے اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ دائرہ عمل کی تقسیم ہے یعنی منکر کا ازالہ طاقت وقوت کے ساتھ تو امراء یعنی امام اور حاکمِ وقت کا کام ہے، اور زبان سے نکیر کرنا علماء کا اور قلب سے بُرا سمجھنا ضعفاء کا یعنی جن کے پاس نہ علم کی قوت ہے اور نہ اقتدار کی طاقت ہے۔(احکام القرآن: ۲/۳۹)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اس کام کی ترغیب دینا اور اس پر امت کی فوز وفلاح کو موقوف رکھنا نیز دیگر عبادات اور اعمال صالحہ کے موجود ہونے کے باوجود محض اس کام کے نہ کرنے کی وجہ سے عذابِ عام میں مبتلا کیا جانا اس بات کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے کام کی فضیلت کتنی ہے اور اس کے ترک کا نقصان کیا ہے؟ تاہم چند آیات واحادیث اس عنوان کے تحت بھی پیش کی جاتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (سورۃ النحل:۹۰)	بے شک اللہ تعالیٰ عدل احسان اور اہل قرابت پر مال خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش ناپسندیدہ اور ظلم کے کاموں سے منع فرماتا ہے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا اور منع فرماتا ہے، معلوم ہوا کہ مولائے کریم جو کام خود کرتا ہے اسی کے کرنے کا بندوں کو حکم دیا ہے، جو بہ جائے خود ایک فضیلت ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (سورۃ الاعراف:۱۵۷)	جو لوگ اس رسول کا اتباع کرتے ہیں جو نبیِ اُمی ہے، جس کے بارے میں اہل کتاب تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی صفت بھی امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے، اسی لئے تو یہاں دیگر صفات سے مقدم کر کے بیان فرمایا، نیز یہیں سے یہ بھی پتہ چلا کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے مبارک کام میں لگنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام میں شریک وشامل ہے، یہ کتنی بڑی فضیلت اور کیسی عالی نسبت ہے، اللہ پاک قدر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سورۂ لقمان آیت: ۱۷ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ”کارِ عزیمت“ یعنی بڑی ہمت کا کام فرمایا گیا۔

سورۂ ذاریات آیت: ۵۵ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر کر کے اسے

ایمانی صفت قرار دیا گیااور اس پر عمل کرنے والوں کوخوشخبری دی گئی ہے۔

سورۂ توبہ آیت: ۷۱ میں صحابۂ کرامؓ کی اس صفت کے ساتھ تعریف کر کے ان سے خوشنودی کا اظہار کیا گیاہے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اہل ایمان کی صفات میں شمار کر کے ایسے لوگوں پر رحمتِ الٰہی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

سورۂ اعراف آیت: ۱۶۵ میں بنی اسرائیل پر سخت عذاب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اس عذاب سے ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائیوں سے لوگوں کو روکا کرتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی فضیلتیں ہیں جو قرآن وحدیث میں جگہ جگہ بیان کی گئی ہے، قدردانوں کے لئے یہی بہت کافی ہیں۔

(ج)
امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کرنے کے نقصانات

جہاں تک اس فریضے سے غفلت اور ترک پر وعیدوں کا معاملہ ہے تو وہ بھی اس قدر سخت اور اتنی زیادہ ہیں کہ اس مختصر رسالے میں جمع نہیں کی جاسکتیں، تاہم چند ایک وعیدیں ذیل میں ملاحظہ فرمالیں۔

یہودیوں کی بربادی ومردودی کے اسباب بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ (سورۃ المائدہ:۷۹)	وہ لوگ جن برائیوں میں خود مبتلا تھے ان سے دوسروں کو منع نہیں کرتے تھے، واقعی یہ ان کی بڑی بری حرکت تھی۔

دوسری آیت میں انہی یہودِ بے بہود کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ
(سورۃ المائدہ: ۶۳)

علماء اور مشائخ نے اپنی قوم کو گناہ کے بول بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکا؟ بے شک یہ ان کی بہت ہی بری حرکت تھی۔

پیچھے حضرت ابن عباسؓ کا قول گذر چکا ہے کہ یہ قرآن کریم کی وعیدوں میں سب سے سخت وعید ہے، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے ترک کی مذمت میں اس سے بڑھ کر اور کیا وعید ہوسکتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے (بنی اسرائیل کی ایک بستی کے بارے میں) جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس بستی کو اٹھا کر پلٹ دو، انہوں نے عرض کیا کہ پروردگار! اس بستی میں ایک بندہ آپ کا ایسا ہے جس نے ایک لمحہ بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے (اس کے جواب میں) فرمایا: اس بندے کے ساتھ ہی ان لوگوں پر بستی کو الٹ دو، اس لئے کہ ساری بستی میری نافرمانی کرتی رہی مگر اس کے ماتھے پر شکن تک نہ پڑا۔

(شعب الایمان 7189)

اللہ اکبر! کتنی عبرت ناک سزا ملی اور کس قدر خطرناک انجام ہوا اس فریضے سے کوتاہی کا کہ مدت العمر کی عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ اس کے انجامِ بد سے بچا نہ سکا، اعاذنا اللہ منہ۔

اس کے علاوہ احادیثِ شریفہ میں امر بالمعروف نہی عن المنکر کو ترک کردینے والوں پر مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کردیئے جانے، دعاؤں کی تاثیر ختم کردیئے جانے، نصرتِ الٰہی سے محروم کردیئے جانے، قلوب کے مسخ اور گڈمڈ کردیئے جانے، وحی کی برکات اٹھالئے جانے وغیرہ جیسی سخت وعیدیں منقول ہوئی ہیں، ان میں سے بعض پچھلے صفحات میں بھی گذر چکی ہیں، یہاں جس قدر مذکور ہوا وہ ہماری عبرت وہدایت کے لئے بہت کافی ہے۔

۱۰

تحفظ الحقوق

آپسی حقوق کی حفاظت کرنا

(الف)

آپسی حقوق کی تعریف و اہمیت

حقوق حق کی جمع ہے، لغت میں باطل کی ضد ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اسماءِ مبارکہ میں سے ایک مبارک اسم بھی ہے، کسی چیز کے ساتھ حق کا استعمال اس کے ثبوت کے معنیٰ میں ہوتا ہے، نیز حق ایسی ثابت شدہ چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے انکار کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

معجم الوسیط کے مطابق حق کسی شخص یا جماعت کے واجب حصے کو کہتے ہیں اور اس کی جمع حقوق ہے، یہاں تحفظ حقوق سے یہی معنیٰ مراد ہیں۔

یہ حقوق دو طرح کے ہیں ۱۔ حقوق اللہ، ۲۔ حقوق العباد۔ مقام و مرتبے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حقوق اللہ کا مقام سب سے بلند ہے، مؤاخذے کے اعتبار سے حقوق العباد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ چوں کہ بہت بے نیاز ہے اس لئے بندوں کی طرف سے اپنی حق تلفی کو بہ آسانی درگذر کر سکتا ہے، بندے چوں کہ محتاج ہیں اس لئے وہ اپنا حق چھوڑنے میں سخی نہیں ہو سکتے بخل سے کام لیتے ہیں نتیجتاً ان کی حق تلفی کرنے والے اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ جب تک اس غلطی کو معاف نہیں کرتا جب تک کہ

صاحبِ حق معاف نہ کردے۔

حق تلفی کا دوسرا نام ظلم ہے، اس کی جمع مظالم ہے، مظالم کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں، مثلاً شرک حق تعالیٰ کی حق تلفی ہے، اس کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ — شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

(سورۃ لقمان: ۱۳)

کافروں کے بارے میں فرمایا:

وَمَا ظَلَمْنَا هُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ — ہم نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا انہی لوگوں نے (اپنے مالک کا حق نہ ادا کرکے) اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

(سورۃ النحل: ۱۱۸)

حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کرلیا ہے اور تم لوگوں پر بھی اس کو حرام کردیا ہے تو تم لوگ آپس میں ایک دوسرے پر ظلم وحق تلفی سے پرہیز کرو۔'' (مسلم:55)

حضرت مولانا منظور نعمانیؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو''ہدایت'' اور''دین'' حق لے کر آئے تھے اس میں سب سے پہلی چیز ایمان اور توحید کی دعوت تھی، پھر جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کرلیتے، ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عملی زندگی کے بارے میں ہدایات دیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ہدایت اور تعلیم کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق بندوں پر اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے اور اس باب میں ان کے فرائض کیا ہیں اور اس حق اور ان فرائض کی ادائیگی کے لئے اُنہیں کیا کرنا چاہیئے۔

دوسرا حصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کا وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ بندوں پر دوسرے بندوں کے اور عام مخلوقات کے کیا حقوق ہیں اور اس دنیا میں

جب ایک انسان کا دوسرے انسان یا کسی بھی مخلوق سے واسطہ اور معاملہ پڑتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے اور اس باب میں اللہ کے احکام کیا ہیں۔

حقوق العباد کا مسئلہ اس لحاظ سے زیادہ اہم اور قابل فکر ہے کہ اس میں اگر تقصیر اور کوتاہی ہوجائے یعنی کسی بندے کی ہم سے حق تلفی ہوجائے تو اس کی معافی اور اس سے نجات وسبک دوشی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے (جو رحیم وکریم ہے) اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا ہے بل کہ اس کی صورت یہی ہے کہ یا تو اس دنیا میں اس بندے کا حق ادا کر دیا جائے یا اس سے معافی حاصل کرلی جائے، اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی یہاں نہ ہوسکی تو آخرت میں لازماً اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا اور وہ بے حد مہنگا پڑے گا یا اس کے حساب میں آخرت کا سخت عذاب بھُگتنا ہوگا جیسا کہ حدیثوں میں تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:

''جس کسی نے اپنے کسی بھائی کے ساتھ ظلم وزیادتی کی ہو، اس کی آبروریزی کی ہو یا کسی اور معاملے میں حق تلفی کی ہو تو اس کو چاہیئے کہ آج ہی اور اسی زندگی میں اس سے معاملہ صاف کرالے، آخرت کے اس دن کے آنے سے پہلے جب اس کے پاس ادا کرنے کے لئے دینار ودرہم کچھ بھی نہ ہوگا، اگر اس کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر مظلوم کو دلا دیئے جائیں گے اور اگر وہ نیکیوں سے بھی خالی ہاتھ ہوگا تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے (اور اس طرح انصاف کا تقاضا پورا کیا جائے گا۔) (بخاری:2449)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اعمال نامے (جن میں بندوں کے گناہ لکھے گئے ہیں) تین قسم کے ہیں، ایک وہ جن کی ہرگز معافی اور بخشش نہ ہوگی، وہ ''شرک'' ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کا گناہ ہرگز نہیں بخشے گا، اور گناہوں کی ایک وہ فہرست ہے جو بندوں

کے حقوق سے متعلق ہے جس کو اللہ تعالیٰ انصاف کئے بغیر نہ چھوڑے گا صاحبِ حق کا حق ظالم سے دلوایا جائے گا، اور ایک فہرست گناہوں کی وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اہمیت اور پرواہ نہیں یہ بندوں کے وہ گناہ اور کوتاہیاں ہیں جن کا تعلق بس ان سے اور ان کے اللہ سے ہے، ان کے بارے میں فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو بالکل معاف کردے"۔ (شعب الایمان: 7069)

بہ ہر حال! حقوق العباد کا معاملہ اس لحاظ سے بہت زیادہ سنگین اور قابلِ فکر ہے کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا بلکہ وہ بندوں سے ہی متعلق ہے اور ان کا حال معلوم ہے (کہ وہ اپنے حقوق چھوڑنے میں بہت بخیل ہیں)۔

پھر حقوق العباد سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے بھی دو حصے ہیں ایک وہ جس کا تعلق معاشرتی آداب و احکام سے ہے، مثلاً یہ کہ ماں باپ کا اولاد کے ساتھ، اولاد کا ماں باپ کے ساتھ، بیوی کا شوہر اور شوہر کا بیوی کے ساتھ، قریب و بعید کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ، بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ، نوکروں، ماتحتوں کے ساتھ، خاص کر کمزور اور ضرورت مند طبقوں کے ساتھ، اسی طرح اللہ کی عام مخلوق کے ساتھ کیا رویہ اور کیسا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح آپس میں ملنے جُلنے، ہنسنے، بولنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، شادی بیاہ اور خوشی و غم کے موقعوں پر کن احکام اور آداب کی پابندی کرنی چاہیئے۔ دین کے اس حصہ کا جامع عنوان معاشرت ہے۔

حقوق العباد سے متعلق دوسرا حصہ وہ ہے جس میں معاشی و مالی معاملات، مثلاً خرید و فروخت، تجارت و زراعت، قرض و امانت، ہبہ و وصیت، محنت و مزدوری یا باہمی نزاعات میں عدل و انصاف، محکمۂ قضا اور شہادت و وکالت وغیرہ سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں، اس کا جامع عنوان معاملات ہے۔ (پس معاشرت اور معاملات سے متعلق تمام احکام اصلاً "حقوق العباد" ہی سے متعلق ہیں، اور ان کا درست رکھنا ہر اعتبار سے بہت ضروری ہے)

(ب)

حقوق سے متعلق احادیثِ مبارکہ

اللہ تعالیٰ کے بارے میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''معاذ: تمہیں معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول ہی کو اس کا زیادہ علم ہے، فرمایا: ''بندوں پر اللہ تعالی کا حق تو یہ ہے کہ اس کی توحید کے قائل ہوں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ اگر وہ شرک سے محفوظ رہیں تو ان کی بخشش ضرور کریں عذاب میں مبتلا نہ فرمائیں''۔ (بخاری:2856)

یہ تو بنیادی اور مرکزی حق ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء وافعال سے متعلق جو عقائد دئے گئے ہیں اور اس کی بندگی وفرماں برداری سے متعلق جو احکام آئے ہیں ان سب کو جاننا، ماننا اور اُن کے موافق عمل کرنا بھی بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، بندوں کو اللہ تعالیٰ کے ان سب حقوق کو ادا کرتے رہنے کی فکر رکھنا چاہیئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے حقوق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''کوئی شخص اس وقت تک مومنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس کے نزدیک میری ذات اس کے ماں باپ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجائے''۔ (بخاری:15)

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ منکر ہوا''۔ (بخاری:7280)

ایک حدیث میں ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے ماتحت نہ ہوجائیں''۔ (شرح السنۃ:104)

تینوں حدیثوں کے مجموعے سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امت پر حق یہ ہے کہ

ان پر ایمان لائے ان سے سب لوگوں سے زیادہ محبت رکھے، ان کی اطاعت کرے اور اپنی خواہشات کو ان کے احکام کا پابند بنالے۔

ماں باپ کے بارے میں:

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی کو قرار دیا ہے۔(بخاری:2654)(جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ عزوجل کو سب سے زیادہ محبوب کونسا عمل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نماز کا اپنے وقت پر ادا کرنا'' پوچھا گیا اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ فرمایا ''والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا''۔(بخاری:527)

ایک حدیث میں ہے کہ ''پروردگار کی رضا والدین کی رضا میں پوشیدہ ہے اور اس کی ناراضگی والدین کی ناراضگی کے ساتھ وابستہ ہے''۔(ترمذی:1899)

ایک حدیث میں ہے کہ (اولاد کی خدمت وشفقت کی) سب سے زیادہ حق دار ماں ہے پھر باپ اور پھر جو جتنا قریبی رشتہ رکھتا ہو'۔(ابوداؤد:5139)

علماء نے اس سلسلے کی سب احادیث کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا ہے کہ اطاعت میں تو اللہ و رسول کے بعد سب سے زیادہ مقام والد کا ہے اور خدمت و راحت رسانی کی سب سے زیادہ حق دار والدہ ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا والدین کے انتقال کے بعد بھی اولاد پر ان کے کچھ حقوق ہوتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیوں نہیں! (چار کام والدین کی موت کے بعد بھی کرنے ہوں گے) ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہنا، ان کی وصیت کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کا اکرام کرنا، اور ان کے ذریعہ بننے والے رشتوں سے حسن سلوک کرتے رہنا''۔(ابوداؤد:5142)

اولاد کے بارے میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''کسی باپ نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق وآداب

سکھانے سے بہتر تحفہ نہیں دیا"۔(ترمذی:1952)

نیز ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل سے و مساوات سے کام لو"۔(بخاری:2587)

ایک حدیث میں ہے کہ "اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انہیں اچھی تربیت دو"۔

(ابن ماجہ:3671)

اقرباء کے بارے میں:

چچا کا حق بتلاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا "آدمی کا چچا رتبے میں اس کے باپ کے برابر ہے"۔(مسلم:983)

اسی طرح خالہ کو ماں کے حکم میں اور بڑے بھائی کو والد کے درجے میں بتلایا گیا ہے:

عام رشتے داروں کا بھی اسلام میں حق ہے، چناں چہ ایک حدیث میں صلۂ رحمی کے زیادہ حق داروں کے بارے میں پوچھنے پر:

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "سب سے پہلے تو تمہارے ماں باپ کا حق ہے، پھر بہن بھائی کا، پھر جو جتنا قریبی رشتہ رکھتا ہو اس کا"۔(مسلم)

ایک حدیث میں ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا فرمایا تو رحم یعنی خونی رشتے نے کھڑے ہو کر عرض کیا: میرا مقصد قطع رحمی کرنے والے سے آپ کی پناہ لینا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "کیا تو اس سے خوش نہیں ہے کہ میں اس کو اپنے سے جوڑے رکھوں جو تجھے جوڑے رکھے اور اس کو اپنے سے کاٹ دوں جو تجھے کاٹ دے؟" اس نے کہا: ہاں یارب! فرمایا "یہ مقام تجھے دے دیا گیا"۔(مسلم:2554)

مسلمانوں کے بارے میں:[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] یہاں سے آخیر تک سب احادیث حضرت حکیم الامتؒ کے رسالہ "حیوٰۃ المسلمین" سے قدرے تسہیل کے ساتھ لے لی گئی ہیں، نیز حوالہ جات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

مسلمان کو بُرا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس سے (بلا وجہ) لڑنا (قریب) کفر کے ہے۔ (بخاری:48)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی شخص (لوگوں کے عیوب کو دیکھ کر اور اپنے آپ کو عیوب سے پاک سمجھ کر شکایت کے طور پر) ''یوں کہے کہ لوگ برباد ہو گئے، تو یہ شخص سب سے زیادہ برباد ہونے والا ہے''۔ (کیوں کہ مسلمانوں کو حقیر سمجھتا ہے)۔ (مسلم:2623)

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنا فرماتے تھے: چغل خور (قانوناً بغیر سزا کے) جنت میں نہ جائے گا۔ (بخاری:6056)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے دن سب سے بدتر (حالت میں) تم اس شخص کو پاؤ گے جو دو منہ والا ہو (یعنی جو ایسا ہو کہ اِن کے مُنہ پر ان جیسا اُن کے مُنہ پر اُن جیسا)۔ (بخاری:6058)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (غیبت یہ ہے کہ) اپنے (مسلمان) بھائی کا اس طرح ذکر کرے کہ (اگر اُس کو خبر ہو تو) بُرا لگے، پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہتا ہوں (یعنی اگر میں اس کی جو بُرائی کر رہا ہوں وہ سچ ہے تو؟) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر اُس میں وہ بات ہے جو تم کہتے ہو تب تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات نہیں ہے جو تم کہتے ہو تو تم نے اُس پر بہتان باندھا۔ (مسلم:2589)

حضرت سفیان بن اسد حضرمیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: بہت بڑی خیانت کی بات ہے کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات ایسی کہے جس میں وہ تجھ کو سچا سمجھ رہا ہے اور تو اُس میں جھوٹ کہہ رہا ہے۔ (ابوداؤد:4971)

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے

(مسلمان) بھائی کو کسی گناہ کی وجہ سے عار دلائے تو اس کو اُس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک کہ وہ خود اس گناہ میں مبتلا نہ ہو" (یعنی عار دلانے کا یہ وبال ہے، اگرچہ یہ وبال کسی خاص وجہ سے ظاہر نہ ہو تو اور بات ہے، البتہ خیر خواہی کی وجہ سے نصیحت کرنے کا کچھ ڈر نہیں)۔ (ترمذی:2505)

حضرت واثلہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "اپنے (مسلمان) بھائی کی کسی دینی یا دنیوی بُری) حالت پر خوشی کا اظہار مت کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُس پر تو رحمت فرمادے اور تمہیں اس حالت میں مبتلا کردے"۔ (ترمذی:2506)

اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "خدا کے بندوں میں سب سے بُرے وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے ہیں اور دوستوں میں جدائی ڈلواتے ہیں"۔

(بیہقی:6708)

حضرت ابن عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "اپنے (مسلمان) بھائی سے نہ (خواہ مخواہ) بحث کیا کرو اور نہ اُس سے ایسی دل لگی کرو (جو اس کو ناگوار ہو) اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کر سکو"۔ (ترمذی:1995)

فائدہ: البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے پورا نہ کرسکے تو معذور ہے، چنانچہ حضرت زید بن ارقمؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ: "کوئی شخص اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس وقت اس کو پورا کرنے کی نیت تھی مگر پورا نہ کرسکا اور (اگر آنے کا وعدہ تھا تو) وقت پر (کسی عذر کی وجہ سے) نہ آسکا تو اس پر گناہ نہ ہوگا"۔ (ابوداؤد:4995)

عیاض بن مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل فرمائی ہے کہ سب لوگ تواضع اختیار کریں، یہاں تک کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے"۔ (مسلم:2865) کیوں کہ فخر اور ظلم تکبر ہی سے ہوتا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر رحم نہیں فرماتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا"۔ (بخاری:6013)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص بیوہ اور غریبوں کے کاموں میں کوشش کرے گا وہ (ثواب میں) اس شخص کے جیسا ہے جو جہاد میں کوشش کرے“۔ (بخاری:5353)

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ”میں اور وہ شخص جو کسی یتیم کو اپنی پرورش میں لے، خواہ وہ یتیم اس کا رشتہ دار ہو یا غیر کا ہو، ہم دونوں جنت میں اس طرح ہوں گے“ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ فرمایا اور دونوں میں تھوڑا سا فرق بھی رکھ دیا“۔ (بخاری:5304) کیوں کہ نبی اور غیر نبی میں فرق تو ضرور ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنت میں رہنا کیا معمولی بات ہے؟۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم مسلمانوں کو آپسی ہمدردی اور باہمی محبت و شفقت میں ایسا دیکھو گے کہ جیسے بدن ہوتا ہے کہ جب اس کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو تمام بدن بدخوابی اور بیماری میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔
(بخاری:6011)

حضرت ابو موسیٰؓ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی سائل یا کوئی ضرورت مند آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (صحابہؓ سے) فرماتے: ”تم سفارش کر دیا کرو کیوں کہ اس سے تم کو ثواب ملے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان پر جو چاہے حکم دے“ یعنی میری زبان سے وہی جواب نکلے گا جو اللہ تعالیٰ کو دلوانا ہوگا“۔ (بخاری:1433) مگر تم کو مفت میں ثواب مل جائے گا، اور یہ سفارش کرنا اس وقت ہے جب کہ جس سے سفارش کی جائے اس کو ناگواری نہ ہو، جیسا کہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو خواہ وہ مظلوم ہو“، ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مظلوم ہونے کی حالت میں تو مدد کروں گا مگر ظالم ہونے کی حالت میں کیسے مدد کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اُس کو ظلم سے روکو یہی ظالم کی تمہاری طرف سے مدد کرنا ہے“۔ (بخاری:2443)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ کسی مصیبت میں اُس کا ساتھ چھوڑ دے، اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت میں رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میں رہتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان کی کوئی سختی دور کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے سختیوں میں سے اس کی سختی دور کرے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی پردہ پوشی کرے گا"۔ (بخاری:2442)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے برے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے (یعنی اگر کسی شخص میں یہ بات ہو اور کوئی برائی نہ ہو تب بھی اُس میں برائی کی کمی نہیں) مسلمان کی ساری چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں، اُس کی جان، اُس کا مال اور اُس کی آبرو"۔ (مسلم:2864) (یعنی نہ اس کی جان کو تکلیف دینا جائز نہ اس کے مال کا نقصان کرنا، اور نہ اس کی آبرو کو کوئی صدمہ پہنچانا جائز ہے۔ مثلاً اس کا عیب کھولنا، اُس کی غیبت کرنا وغیرہ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک پورا ایمان والا نہیں بنتا جب تک کہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔ (بخاری:13)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "وہ شخص جنت میں نہ جائے گا جس کا پڑوسی اس کے خطرات سے مطمئن نہ ہو"۔ (مسلم:46) یعنی اُس سے نقصان کا اندیشہ رکھتا ہو)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "وہ شخص ہماری جماعت سے خارج ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑی عمر والوں کی عزت نہ کرے، اور نیک کاموں کی نصیحت نہ کرے، اور بُرے کام سے منع نہ کرے"۔ (ترمذی:1921) کیوں کہ یہ بھی مسلمان کا حق ہے کہ موقع پر اُس کو دین کی بات بتلا دیا کرے،

مگر نرمی اور تہذیب سے بتلانا چاہیئے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہو رہی ہو، اور اس کو اُس کی مدد کرنے پر قدرت ہو اور وہ اُس کی مدد کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اُس کی مدد فرمائے گا، اور اگر اس نے اس کی مدد نہ کی حالاں کہ وہ اُس کی مدد کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پکڑ فرمائے گا"۔

(شرح السنہ:3424)

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص (کسی کا) کوئی عیب دیکھے پھر اُس کو چھپائے (یعنی دوسروں سے ظاہر نہ کرے) تو وہ (ثواب میں) ایسا ہوگا جیسے کسی نے زندہ دفن کی جانے والی لڑکی جان بچالی"۔ (ترمذی:1839) گویا کہ قبر سے اُس کو زندہ نکال لیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک شخص اپنے بھائی کا آئینہ ہے، پس اگر اُس (اپنے بھائی) میں کوئی غلط بات دیکھے تو اس سے دور کردے"۔ (ترمذی:1929) (جیسے آئینہ چہرہ کا داغ دھبّا اس طرح صاف کر دیتا ہے کہ صرف عیب والے پر ظاہر کرتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا، اسی طرح اس شخص کو چاہئے کہ اپنے بھائی کے عیب کی خفیہ طور پر اصلاح کردے، رسوا نہ کرے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لوگوں کو اُن کے مرتبے پر رکھو"۔ (ابوداؤد:4842) یعنی ہر شخص سے اس کے مرتبے کے موافق برتاؤ کرو، سب کو ایک لکڑی سے مت ہانکو۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "وہ شخص (پورا) ایمان والا نہیں جو خود اپنا پیٹ بھر لے، اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

(بیہقی:3389)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "مومن الفت و

محبت کا محل ہے، اور اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو کسی سے نہ خود محبت رکھے اور نہ کوئی اس سے محبت کرے"۔(بیہقی:8119) یعنی سب سے روکھا اور الگ تھلگ رہے، کسی سے ملنا جلنا ہی نہ ہو، باقی دین کی حفاظت کے لئے کسی سے تعلق نہ رکھنا یا کم رکھنا وہ مذموم نہیں ہے اس کا حکم اس سے علاحدہ ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:"جو شخص میری امت میں سے کسی کی ضرورت صرف اس نیت سے پوری کردے کہ وہ خوش ہو جائے، تو اُس شخص نے مجھ کو خوش کیا، اور جس شخص نے مجھ کو خوش کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا"۔(بیہقی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:"جو شخص کسی پریشان حال آدمی کی مدد کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے تہتّر مغفرت لکھے گا، جن میں ایک مغفرت تو اُس کے کاموں کی اصلاح کے لئے (کافی) ہے اور بہتّر مغفرتیں قیامت کے دن اس کے لئے درجات ہو جائیں گی۔(بیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:"جس وقت کوئی مسلمان اپنے بھائی کی بیمار پرسی کے لئے جاتا ہے، یا ویسے ہی ملاقات کے لئے جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو بھی پاکیزہ ہے تیرا چلنا بھی پاکیزہ ہے، تو نے جنت میں اپنا مقام بنالیا ہے"۔(ترمذی:2008)

حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلق توڑے رکھے، اس طرح کہ دونوں ملیں مگر یہ اُدھر کو منہ پھیر لے اور وہ ادھر کو منہ پھیر لے، اور ان دونوں میں اچھا وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے"۔(بخاری:6077)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ:"اپنے کو بدگمانی سے بچاؤ کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، اور کسی کی چھپی ہوئی حالت کی ٹوہ میں

مت لگو، نہ اچھی حالت کی نہ بری حالت کی، اور نہ دھوکہ دینے کے لئے کسی چیز کی قیمت بڑھاؤ، اور نہ آپس میں حسد کرو نہ بغض رکھو، اور نہ پیٹھ پیچھے غیبت کرو، اور اے اللہ کے بندو! سب بھائی بھائی بن کر رہو"۔ اور ایک روایت میں ہے: نہ ایک دوسرے پر رشک کرو۔
(بخاری:5143)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں (اُس وقت انہی چھ کے ذکر کا موقع تھا) عرض کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۱) جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کرو۔ ۲) جب وہ تجھ کو دعوت دے تو قبول کر۔ ۳) جب وہ تجھ سے خیر خواہی چاہے تو اس کی خیر خواہی کرو۔ ۴) جب چھینکے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو۔ ۵) جب بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرو۔ ۶) اور جب مر جائے تو اس کے جناز کے ساتھ جاؤ"۔ (مسلم:2162)

حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ کا معاملہ کرے"۔ (ترمذی:1941)

نوٹ: یہ سب اکثر پیش آنے والے عام مسلمانوں کے حقوق ہیں، اور خاص اسباب خاص حالات کے حساب سے بھی خاص خاص حقوق ہیں، جن کو میں نے رسالہ "حقوق الاسلام"[1] میں لکھ دیا ہے، سب کو ادا کرنے کی خوب کوشش کرو، کیونکہ اس میں بہت لاپرواہی ہو رہی ہے۔ اللہ عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

---

[1] حضرت حکیم الامتؒ کا یہ رسالہ سلسلہ اصلاح و تربیت نمبر ۸ میں تسہیل کے ساتھ شامل ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔

سلسلۂ اصلاح وتربیت کی ایک اہم کتاب ’’مظلماتِ باطنی‘‘ جس میں دل کی بیماریوں اوران کے علاج پر تفصیلی کلام کیا گیا۔ یہ کتاب شائع ہوچکی ہے۔

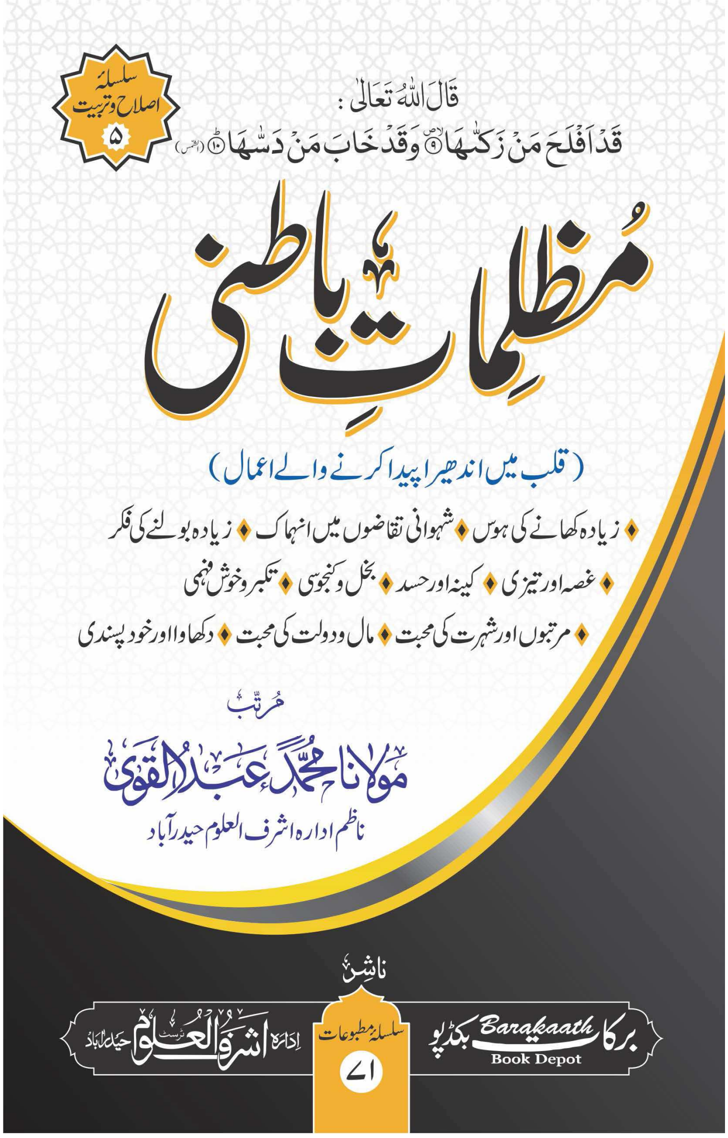
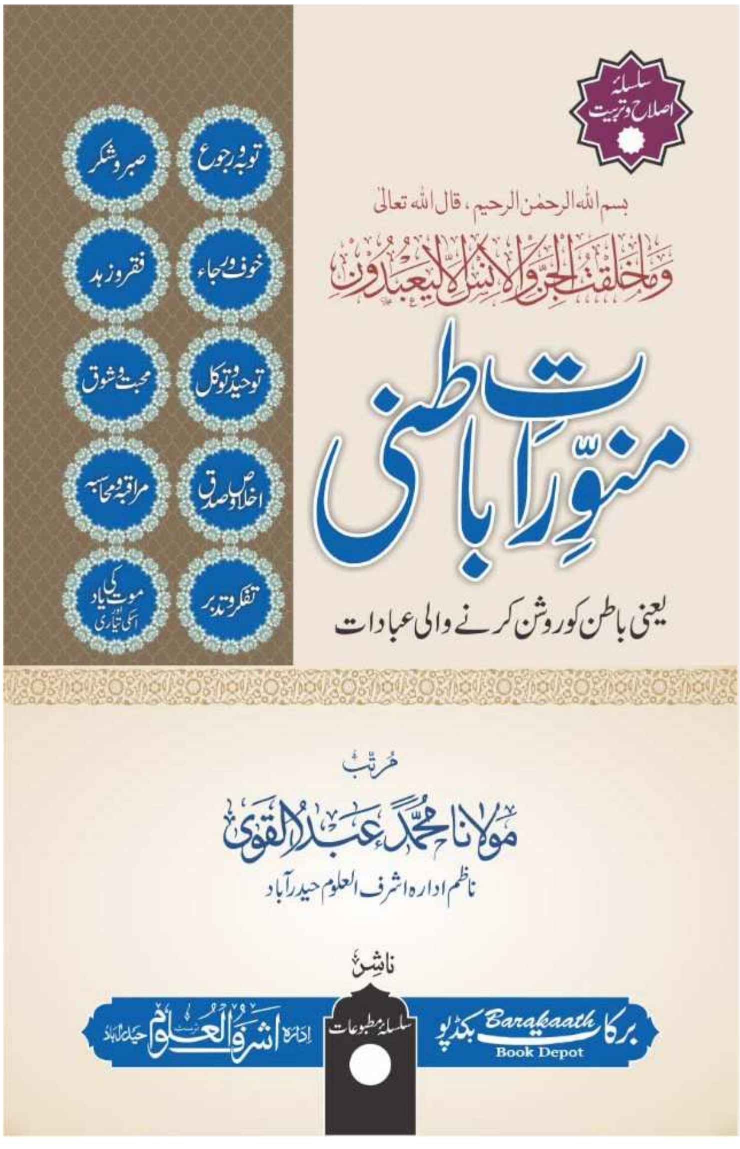
سلسلۂ اصلاح وتربیت کی ایک اہم کتاب ''منوراتِ باطنی''، جس میں دل کو روشن
کرنے والے اعمال پر تفصیلی کلام کیا گیا۔ یہ کتاب زیر ترتیب ہے۔